

گلستریزس خواتین کا مقبول ترین ناول

# دریائے امید کے دریاؤں کا گھر

آسیہ مرزا

PDFBOOKSFREE.PK

# درامید کے درپوزہ گر

از

سیہ مرزا

## انتساب

چچے برحق سائیں  
کے نام

اس بہتی ریت کے دریا پار  
کیا جانے ہیں کیا کیا اسرار  
تم قہاروں طرفوں کے  
اور میرے چار طرف دیوار

## پیش رفت

غم دکھ ہر حالت میں زہر ہے، چاہے یہ دکھ اجتماعی ہو یا انفرادی۔ کسی کا رونا ایک حساس شخص کا رونا بھی بن جاتا ہے، اور حساس شخص اگر ادیب ہو، تو وہ یہ غم لفظوں کے قالب میں ڈھالتا ہے۔

جنگ اپنی یاد دوسروں کی، اگر حق کی ہے تو اس کا ساتھ ضرور دیجئے۔ یہ نہ سوچیں کہ ہم نہ رہیں گے یہ سوچیں غم بھی نہ رہیں گے۔

اس کتاب کے حوالے سے میں صرف یہ کہوں گی کہ ہو سکتا ہے کہ اس میں ایک قاری کی تسکین کا سامان نہ ہو مگر نہ جانے کیوں خوش گمان سائقین ہے کہ اسے پڑھ کر پ بھی میرے ساتھ اس جنگ میں شامل ہو جائیں گے۔ رواج، روایتیں، رسمیں اگر پھول جیسی ہوں تو ان کی ڈور تھامے کوئی نہیں تھکتا، خوشبو کا سفر محسوس ہوتا ہے مگر یہی روایتیں خنجر کی نوکوں اور بھول جیسی ہوں تو ان پر چلنے والوں کے پیر لہو لہان ہو جاتے ہیں۔ روح مجلس جاتی ہے۔

اور یہ بھی سچ ہے کہ روشنی کی منزل خود چل کر کبھی نہیں آتی۔ منزل کے لئے سفر کا شعور ضروری ہے کوئی روزن، در، کھولنا ضروری ہے، اک ذرا سی روشنی کی لکیر دبیز اندھیرے کا سینہ چیر دینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اور یہی شعور میں اس کہانی میں پیدا کرنے کی ادیسی کوشش کی ہے۔



معروف شاعر امجد اسلام امجد صاحب نے اس حوالے سے بڑی خوبصورت بات کہی ہے۔

بشارتوں کا وردان کے لئے نہیں ہے جو منتظر ہیں  
سکوں کی منزل خود پ چل کر قریب آئے  
حصول منزل بنا سفر کے نہ ہو سکا ہے کبھی نہ ہوگا  
مسافروں کے لئے سفر کا شعور لازم

دراُمید کے درِ یوزہ گر ماہنامہ کرن کراچی میں قسط وار شائع ہونے والا ناول جس کو پہلی بار کتابی شکل میں محترم مبین خلک صاحب شائع کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی ہر تحریر کو پوری دیانت، محنت اور توجہ سے لکھا ہے۔ مجھے پ کے تبصروں اور تعمیری تنقید کا بڑی شدت سے (معرفت ناشر) انتظار رہے گا۔

مخلص

دراُمید سیہ مرزا

## ناول کا آغاز

شیشوں اور اون کے بنے جگمگ کرتے گلے اس کے سامنے رکھے تھے اس کی نگاہیں  
تشکر سے بلیقیں پراٹھیں۔

اتنی محنت کیوں کرتی ہے تو میرے لئے بلیقیں۔ اس کی نازک سفید انگلیاں بلیقیں کے  
گندی ہاتھوں پر جم گئیں۔ تیرے یہ ہاتھ دکھ نہیں جاتے۔  
حویلی کے باغیچے کے خری گوشے میں کھجور کے درخت کے نیچے وہ یہ لہجے بلیقیں کے  
ساتھ گزار کر مسرور ہوتی تھی۔ بلیقیں ج بڑے خوبصورت گلے اور گلابی اس کے لئے بنا کر  
لائی تھی۔

سائینڈن تم جب ایسا بولتی ہونا تو میں خود کو کوئی بہت وڈی شے سمجھنے لگتی ہوں۔ یہ کون سا  
مشکل کام ہے کہ ہاتھ پیر دکھیں۔ بس تم پہن لو، تو سمجھوں میری محنت وصول ہوگئی۔  
کتنی دفعہ کہا ہے سائینڈن نہ کہا کر مجھے، صرف زبیل بولا کر۔ اس نے پیار  
بھری سرزنش کی۔ بلیقیں مسکرا دی۔

ادی زبیل میرے کہنے نہ کہنے سے فاصلے تو اتنے ہی رہیں گے نا۔  
فاصلے صرف سوچ اور احساس سے جنم لیتے ہیں، نہ سوچ تو کوئی فاصلہ نہیں۔ اس بڑی

حویلی میں زیورات سے لد کر بھی میں ایک لڑکی ہی ہوں۔ تمہاری جیسی، بے اختیار، بے حیثیت۔ بس میرے پاس اچھے کپڑے، بہت سے زیورات اور بہت زیادہ فراغت ہے۔ چھوڑ یہ بتا تو یہ سارا کام کس وقت کرتی ہے۔ بچل ادا تجھے روپیہ پیسہ نہیں دیتا کیا۔

نہ سائیڈن، ادا بچل تو میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔ یہ تو بس میرا اپنا شوق ہے۔ ادی زیمیل اک بات پوچھوں۔  
ہوں۔

پرسوں رات حویلی میں بڑا چراغاں ہوا تھا۔  
اس نے ڈرتے ڈرتے پوچھنا چاہا۔ زیمیل نے سراٹھایا۔  
اور یہ بھی پتا ہوگا کیوں؟ اس کا چہرہ اداسی میں ڈھل گیا مگر لبوں پر نرم مسکراہٹ بدستور رہی۔ بلقیس کو حوصلہ ہوا۔

مالکن کیسی ہیں؟ اس کی نکھوں اور لہجے میں بے پناہ تجسس فپک رہا تھا جو فطری تھا۔  
حویلی میں وڈیرہ حق نواز کی تیسری بیوی نے قدم رنجہ فرمایا تھا۔ کہنے کو بڑی سادگی سے عقد ہوا تھا مگر وڈیرے کی سادگی یہی تھی کہ حویلی کے طاقتور کو دیوں سے سجایا گیا، گاؤں کے غریبوں میں دیگوں کے چاول تقسیم ہوئے، پٹاخے چھوڑے گئے تھے، ہوائی فائرنگ ہوئی تھی۔  
ہاں بہت اچھی ہے، نہایت تیری میری عمر سے بس چند سال ہی بڑی ہوگی۔  
اس نے دھیرے سے کہا (اگر ادا مہران کی زال بن کر تھی تو اچھا بھی لگتا)



ہائے رب۔ بلقیس کا ہاتھ بے اختیار سینے پر یا مگر دوسرے لمحے کھیا کر سر ہلانے لگی۔  
سٹھی ہوگی۔

ہوں بہت زیادہ۔ وہ جیسے کسی خیال سے چونک کر بولی۔ اس کے لبوں کی تراش میں  
مسکراہٹیں گھل گئیں۔ وہ بلقیس کو دیکھ رہی تھی۔

میں نے سنا ہے تیرا رشتہ یا ہوا ہے ج کل۔ یہ سوال کرتے ہوئے اس نے بلقیس کے  
رخساروں پر سرخی تھی محسوس کی۔ وہ بچاری اس غیر متوقع سوال پر شرما کر گلے تہہ کرنے لگی۔

بس جہاں بیری ہوتی ہے وہاں پتھر تو تے ہی ہیں نائسائیڈن۔ چھوریاں (لڑکیاں)  
بیری ہی ہوتی ہیں نا۔ یہ بہت سادہ سا جملہ تھا مگر زیمل حق نواز کے سینے کے اندر دھڑکتے جوان  
دل کو چھید کر گزر گیا۔

لڑکیوں بالیوں کے لئے بیری کی تشبیہ بہت پرانی تھی اور ان پر پتھر نے کی مثل بھی اس  
نے سن رکھی تھی مگر اسے یہ سوچ زخمی کر رہی تھی کہ۔۔۔۔۔

وہ اور ادی عابدہ بھی تو لڑکیاں ہی تھیں، بیری تھیں ان پر پتھر کیوں نہیں تے، وہ کیوں  
درخت سے نہیں جدا ہوتیں۔

مگر نہیں۔

ئے تو تھے، ادی عابدہ جب نو خیز تلی جیسی رنگین ہوا کرتی تھیں۔ شباب کی کرنوں سے  
جگمگ جگمگ کرتی تھیں، تب بہت سے پتھر ئے تھے۔ مگر سب حویلی کی ریت روایتوں کی

دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ گئے، مارنے والے ہاتھ بھی تھک گئے۔ اور ادوی عابدہ کی کرنیں بھی ماند پڑ گئیں۔ تتلی کے رنگ بھی عمر کی سورج سے مرجھانے لگے اور وہ سرخ بیری ایک کمرے کے اندر محصور ہو کر خاموش احتجاج کرتے کرتے تھک گئی۔

رواج، روایتیں، رسمیں پھولوں جیسی ہوں تو ان کی ڈور تھامے کوئی نہیں تھکتا، خوشبو کا سفر محسوس ہوتا ہے۔ مگر یہی روایتیں خنجر کی نوکوں اور بول کے کانٹوں جیسی ہوں تو ان پر چلنے والے کے پیر لہو لہان ہو جاتے ہیں، روح جھلس جاتی ہے۔ ستم یہ ہے کہ ان روایتوں کی سلگتی بھٹی کو گرم رکھنے کے لئے عورت ذات ہمیشہ سے ایندھن کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہے۔ اس کے دم سے روایتیں زندہ ہیں، اسی کے وجود سے مرد ذات کا فخر قائم ہے اور جانے کب تک قائم رہے گا۔

ابھی تو ابا سوچ بچار کر رہے ہیں۔ بلقیس کو لطف بھی رہا تھا اس موضوع سے، اور شرم سے کٹ بھی رہی تھی۔

اپنے گوٹھ کے ہی ہیں؟

مجھے کیا خبر۔ وہ بیر بہوٹی بن سی گئی۔ ذریعہ زور سے ہنس پڑی وہ بھی کھیا کر بننے لگی۔ اسے تو ادھر کو کیا کر رہی ہے؟ پچل کی واڑ پر بلقیس کی قل قل یوں بند ہو گئی جیسے کسی نے ہنسی کی پھوار کے گے ہاتھ رکھ دیا ہو۔ وہ گھاس کے فرش پر سے گھڑی ہو گئی۔

ہزار دفعہ کہا ہے، بابا اپنی اوقات دیکھ، مالکن سے یوں پڑ پڑ نہ شروع ہو جایا کر، یہ تیرے



بھیجے میں کوئی بات سماتی ہی نہیں۔ جا گھر جا۔

پچل زیمیل حق نواز بے تنبیہی انداز میں پچل کی طرف دیکھا اور اپنی نفیس اجرک کوشانوں پر پھیلا کر بیچ سے کھڑی ہو گئی۔ اس کا چہرہ لال ہو گیا، نکھوں میں خفگی چھلک رہی تھی۔ اسے پچل کا یہ لب و لہجہ سخت ناگوار گزرا۔

سائینڈن مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی۔ وہ جلدی سے ہاتھ جوڑ بیٹھا۔

ہاں، میں نے تمہیں پہلے بھی منع کیا تھا کہ بلقیس کو یہاں نے سے مت روکا کر، نہ مجھ سے باتیں کرنے سے، یہ میری مرضی سے یہاں تی جاتی ہے۔

ہاں ادا ج تو میں یہ گلے دینے لگی تھی۔ بلقیس کو اسے اپنی حمایت میں بولتے دیکھ کر تقویت ملی۔ اس نے سارے گلے جو ایک صاف ستھرے کپڑے میں بندھ لئے تھے، زیمیل حق نواز کی طرف بڑھا دیئے۔

میں اب چلوں گی، اماں راہ دیکھ رہی ہوگی۔ وہ اس سے اجازت لے کر چلی گئی۔

وڈیری نے رخ موڑ کر پچل کو دیکھا جو بحرمانہ انداز میں ایک طرف کھڑا تھا۔

یہ میری ہم عمر ہے، ہم دونوں ایک دوسرے سے باتیں کر کے خوش ہوتے ہیں، تم نے اس بیچاری کا دل توڑ دیا۔

سائینڈن معافی چاہتا ہوں، ہم کم ہاری لوگ اور پرمیس لوگ، کہاں مٹی کہاں سمان کا جوڑ۔ کچھ اونچ نیچ ہو گئی تو ہم غریب لوگ مارے جائیں گے۔

چل تم بابا سائیں کے ملازم ہو، کام کرتے ہو تب بدلے میں پیشہ ملتا ہے۔ کوئی خیرات تم بھی نہیں لیتے۔

یہ پ برے لوگوں کی مہربانی ہے سائین، کہ پ ہم کو عزت دیتے ہیں۔ پرادی یہ بڑی اونگی بوگی ہے، اور ایک وہ چریا سجاوہ ہے جس نے دو چار جماعتیں پڑھ کر خود کو نجانے کیا سمجھ لیا ہے۔ میں ان دونوں سے بڑا ڈرتا ہوں، وہ سجاوہ تو چلو گوٹھ کم ہی تا ہے تو اچھا ہے۔ زبیل حق نواز کے قدم لمحہ بھر کو ٹھکے۔ دل سینے کی دیوار سے ٹکرا کر ایک نئی کیفیت سے دو چار ہوا۔

وڈیری پ ناراض تو نہیں ہونا؟

ناراض تو نہیں ہوں، پر سندہ ایسی غلطی نہ کرنا۔ بلیس کو یہاں نے جانے سے نہ روکنا۔ وہ پلٹ کر بولی۔ اس کا لہجہ درشت نہیں تھا، مگر مضبوط اور ن بان والا تھا۔ وہ یہ کہہ کر بڑے بڑے قدم بڑھاتی رہائشی حصے کی طرف بڑھ گئی۔



اسیں گرور رامور یلا کا کر

پیٹ پراں







میرے من میں عکس کسی کا  
عکس بنا جو کر چیوں سے  
کر چیاں جو میرے من میں چھپتی رہتی ہیں  
ہر سو موت کے کالے بادل  
میری راہیں نکلتے ہیں  
کان میں سرگوشی کرتے ہیں  
تو بخ نہیں سکتی  
ہاں میں بھی جانتی ہوں کہ  
صدیوں سے میں ماری جاتی ہوں  
مرنے کا کوئی غم نہیں  
میں نہیں ڈرتی اس موت سے  
جو لازم اک دن آتی ہے  
مگر

حویلی کی دیواروں کے پیچھے گھٹ گھٹ کر  
غلامی کی موت نہیں مروں گی  
موت سے ٹکرا کر کہوں گی



مجھ کو مہلت دی جائے  
تاکہ حویلی سے نکل کر زادی کی موت مروں  
کیونکہ میں ماری نہیں

میں بیسویں صدی کی عورت ہوں

میں زاد جینا

اور زاد مرنا چاہتی ہوں

اپنوں سے زاد

رسموں سے زاد

مجھ کو زاد مرنے دو

زیمیل، زیمیل پاگل ہو جائے گی مر جائے گی یوں رو رو کر۔ ادی عابدہ اسے  
جھنجھوڑنے لگیں۔

نہیں ادی، میں اب یوں گھٹ گھٹ کر نہیں مروں گی میں اس حویلی سے نکل کر مروں  
گی۔ اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا اس کی نکھیں لال ہو رہی تھیں۔ مگر چہرے پر خطرناک حد  
تک سرد مہری چھائی ہوئی تھی، ایسی سرد مہری جو عابدہ حق نواز کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں اترتی  
محسوس ہوئی۔

انہوں نے پہلے قدرے چونک کر پھر قدرے تشویش کے ساتھ اسے دیکھا۔

کیا مطلب ہے تیرا۔ وہ فرش پر ہی اس کے نزدیک بیٹھ گئیں۔  
کس بات کا مطلب۔ اس نے پتھرائی نظریں اٹھائیں۔

یہی اس بات کا جو تو سوچ رہی ہے اور بول رہی ہے، دیکھ زینل اللہ کے واسطے ایسی کوئی بات نہ سوچنا جو حویلی کے وقار کو داغ لگا دے دیکھ تو۔۔۔۔۔

حویلی، یہ اونچی دیواریں، قفس ہیں، ہمارے لئے جس بے جا میں ڈال دیا گیا ہے ہمیں، اس کا وقار۔۔۔۔۔۔ اس کا وقار۔ صرف ہمارے خون سے پنپ رہا ہے۔ یہاں صرف عورت کے ہر اقدام سے وقار اور عزت گونوا جاتا ہے۔

نہیں ادی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں بابا سائیکس کے اس اصولوں ان روایتوں اور مظالم کے گے سر نہیں جھکاؤں گی، میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں کہ میں عابدہ حق نواز نہیں ہوں، میں ذلیل ہوں، میں اس صدی کی لڑکی ہوں، زندگی جیتی جاگتی، لڑکی ہوں، اپنا برا بھلا سمجھنے کا شعور رکھتی ہوں، میں بھی ان مردوں کی طرح دل رکھتی ہوں۔

خوابش پالتی ہوں۔

اللہ کے واسطے ہستہ بول۔ عابدہ نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔  
ایک دوپل وہ چپ رہی، بس چپ کی سنگتی دیکتی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔  
میں جانتی ہوں میری بہن، بابا سائیں کا فیصلہ تیرے دل کو چیر رہا ہے، پردھی رانی یہاں  
تو ہمیشہ سے یہ ہوتا یا ہے اور ہوتا رہے گا، میں نے تجھے پہلے بھی -----













میں جھک گئی۔

سچل پر تو گویا ہزار پتھر لڑھک گئے اسے لگا جیسے اس کی سماعتوں پر یکے بعد دیگرے کئی دھماکے ہوئے ہوں اور یہ چھت اس پر گری ہو۔

سائیں ڈن۔ اس کی واز کانپ کر رہ گئی حیرت اور خوف کے ملے جلے احساسات سے اس کی قوت گویائی سلب ہو گئی۔

[illegible]

سجاول کے بنا میں ادھوری ہوں، میں زندہ رہنا چاہتی ہوں بچل، کیا اس دنیا میں مجھے خوشیاں حاصل کرنے کا حق نہیں ہے۔ وہ رو رہی تھی، بلک رہی تھی۔ بچل کے پیروں پر اس کی اڑک انگلیاں لرز رہی تھیں۔ یکدم بچل جیسے ہوش میں گیا۔ وہ ہستکی سے ہٹا اور جھک کر اسے تمام کر کھڑا کر دیا۔

مجھ پر رحم کرو ساکن، یوں مجھے شرمندہ تو نہ کرو، میں بڑا حقیر بندہ ہوں اور اتنی بڑی آزمائش۔ اس نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے، تب بلیقیس چلتی ہوئی ان دونوں کے نزدیک گئی۔ زبیل کی چادر فرش سے اٹھا کر اس کے سر پر ڈال دی۔

رت نئی نہ بولاں

تو، سیدی پھاٹ مراں

تھر کی گلوکارہ کی واز کا سوز اسے جکڑے ہوئے تھا۔ وہ بیڈ پر چپت لیٹی اس واز کی لے میں ڈوب اور ابھر رہی تھی کہ بھاگل نے ہسنگی سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔  
روشنی کی باریک لکیر نے ن واحد میں گھپ اندھیرے کا سینہ چیر ڈالا۔ اس نے گردن موڑ کر دیکھا اور پھر اٹھ بیٹھی۔

ہوں کیا بات ہے بھاگل اندر جا۔ اس نے دائیں طرف جھک کر ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر کا بٹن بند کر دیا۔

سچی خبر لے کر نئی ہوں سائیڈن۔ بھاگل نے اندر کر بتی جلائی۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی جس میں لڈو تھے۔

منڈھے (چھوٹے) رئیس جی کی سگائی کی خبر لائی ہوں اور یہ لڈو بھی اسی خوشی کے ہیں۔  
اس نے لڈو پلیٹ سے اٹھا کر زیمل کے منہ کی طرف بڑھایا۔

کیا۔۔۔۔۔ ادا مہراں شاہ کا رشتہ چاچا سائیں نے قبول کر لیا۔ اس نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساس کے ساتھ بیڈ سے نیچے چھلانگ لگائی۔

ارے چری بھاگی کیا میں صرف چپ چاپ ایک لڈو کھا لوں گی۔ اس نے بھاگل کے ہاتھ سے لڈو اٹھا کر منہ میں رکھا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی جھلک رہی تھی۔ اس نے



ادا سجاوُل بھی تیرا یہ احسان زندگی بھر نہ اتار سکے گا، مان جا ادا، ورنہ ورنہ، دو زندگیاں  
برباد ہو جائیں گی، بلکہ صدیوں تک یہی ریت چلتی رہے گی، کب تک ان ریت رسوں کا  
ایندھن ہم عورتیں بنتی رہیں گی، کوئی بھائی تو ایسا ہو جو بہن کے لئے گھنا سایا ہو، اس خوشیوں کا  
رکھوالا ہو۔ بلقیس نے زیمل کو خود سے لگا لیا۔

مجھے یقین ہے سجاوُل کھلے دل سے اپنے بازو وا کر دے گا تمہارے لئے۔  
پچل گم صم دونوں لڑکیوں کو دیکھتا رہا۔ زیمل حق نواز کے گے اے اپنے کندھے جھکتے  
ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

اگر وہ زیمل کی بات مان لیتا تو یہ حویلی والوں سے سراسر نمک حرامی ہوتی، اور اگر انکار  
کرتا تو ایک لڑکی کی، ایک جیتے جاگتے وجود کی موت ہوتی۔  
جمعہ کو صرف دو روز ہی تو رہتے تھے۔ اس کی نظریں زیمل حق نواز پر اٹھیں تو وہ اندر تک  
سے بل گیا۔

اس کے تصور میں سجاوُل گیا۔ جیسے وہ بھی التجا کر رہا ہو کہہاں ادا، میری زیمل کو مجھ  
سے جدا ہونے سے بچالو، اسے زندہ درگور ہونے سے بچالو۔

ٹھیک ہے ادی، میں پروگرام بناتا ہوں، پھر آپ سے ملنے وں گا مگر۔ وہ  
ہاتھ ملتے ہوئے سر اٹھا کر کچھ سوچنے لگا پھر بولا۔

تم پھر سوچ لو ادی یہ بہت بڑا قدم ہے جو تم اٹھانے جا رہی ہو، بے شک، سجاوُل ایک بھر





میرے لئے دعا کرنا بلیس۔ اس نے خاموش نظروں سے کہا پھر چادر پیشانی تک ڈال  
کمر گاڑی میں جا بیٹھی۔

بلیس تب تک کھڑی رہی جب تک گاڑی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ پھر اندر کی تو  
چل چار پائی پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

وہ چپ چاپ اپنے معمول کے کام میں لگ گئی۔  
مگوشب وروز

تیری یاد تیرے خواب

راستہ ہیں

پر میری جان

فقط یاد سے کب شہر بستے ہیں

کب بھلا دشت کوئی خواب سے سیراب ہوا

اس کی نکھوں کے گوشے بھیلے ہوئے تھے مگر بند نکھوں کے اندر سجادول شاہ کا تصور

دک رہا تھا۔

میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا سجادول کہ یوں میری بے کیف زندگی میں تمہاری چاہت  
کے رنگ دک انھیں گے۔ میرے خالی ہاتھوں میں محبت کے گلاب دے کر تم میرا پور پور معطر کر  
دو گے۔ یہ تمہاری محبت کا اعجاز ہی تو ہے۔ تمہارا مہربان وجود ہی تو ہے جس نے میرے

اندھیروں کو سمیٹ لیا ہے سجاول، میرے اندر باہر کی ساری اداسیوں کو چھپا لیا ہے۔

اس کا نازک ہاتھ سجاول کے مضبوط ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

چاہنے سے زیادہ چاہے جانے کا احساس فخر بخشتا ہے۔

ایک شام اس کی سجاول سے ہونے والی یہ مختصر اور اتفاقیہ ملاقات تھی جو اس کے چشم تصور میں بکھر بکھر کر سمٹ رہی تھی۔ سجاول کی فسوں خیز آنکھوں کا ظلم وہ ایک بار پھر اپنے پور پور میں محسوس کرنے لگی۔

اس کے ہاتھ کالس اپنی انگلیوں پر پھر سے محسوس ہونے لگا۔

نہیں زبیل محبت خود زمین کے سینے سے پھوٹنے والے سفید گلاب کی طرح ہے جو دل کی سر زمین کو اپنی مہک سے معطر کر دیتا ہے اجالا تو تم نے میرے اندر باہر کر دیا ہے۔

اس کی نرم واز اس کے کانوں میں یوں اتری جیسے صحراؤں میں، باد نسیم چلی ہو۔ جیسے سوکھی کھیتی پر برکھارت کا سندیسہ لانے والی پھوار گرے۔ جیسے تھر کی زمین پر بارش کے قطرے۔

یاد رکھنا سجاول، میرے حصے کی ساری روشنیاں تمہاری ہتھیلی میں ہیں، چاہو تو تم منہی کھول کر زیم نور کر دو، چاہو تو ظلمتوں میں دھکیل دو۔

یہ محبت میں تم لڑکیاں اتنی خوفزدہ وہمی اور پاگل کیوں ہو جاتی ہو۔

اس کی ہنسی بھر پور اور جاندار تھی، ساتھ اس کی نرم ہنسی بھی شامل ہو گئی۔

پاگل تو میں ہوں ہی، وہ تو تم کہتے ہی ہو۔ وہ بانس کا تنکا اٹھا کر انگلیوں پر پھیرنے لگی۔  
نہ صرف پاگل ہو، بلکہ پاگل کر دینا بھی جانتی ہو، وڈیری زیمیل حق نواز، مجھ غریب پر رحم  
کرو، کسی نے دیکھ لیا تو بے کار میں الزام دیں گے کہ میں وڈیری کوششے میں اتار رہا ہوں۔ اس  
نے یہاں وہاں دیکھتے ہوئے مصنوعی گجراہٹ کا اظہار کیا۔

وہ دونوں نہر کی طرف قطار میں لگے درختوں کے پاس کھڑے تھے۔  
سچ ہی تو کہیں گے لوگ۔ وہ اس کی والہانہ نظروں کے حصار سے شرما کر بولی  
اور ہنس دی۔

وہ تنے سے ٹیک لگائے سینے پر بازو لپیٹے اسے بڑی خوبصورت نظروں سے دیکھ رہا تھا پھر  
سنجمل کر بولا۔

جاؤ زیمیل، کسی نے دیکھ لیا تو خواخوہ باتیں بنیں گی، میں نہیں ڈرتا مگر تمہاری عزت مجھے  
اپنے تمام تر رزوؤں سے زیادہ عزیز ہے، کسی گندے حرف کا چھینٹنا تمہارے دامن پر  
میں گوارا نہیں کروں گا۔

اس کی واز بارعب اور پر تشویش تھی۔

وہ ایک دوپل فخر اور انبساط سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر دل میں خوشگوار احساس  
سیٹھ پلٹ گئی۔

اچانک اس کی پلکیں کھلیں اور وال کلاک سے ٹکرائیں تو سہانا منظر نظروں سے پلک جھپکتے



ہی ہٹ گیا اور اس کی جگہ وحشت نے لے لی۔

وہ جو قدم اٹھانے جا رہی تھی وہ خوشگوار اور مسرور کن نہیں تھا بلکہ ایک ایک لمحے کے ساتھ اس کا دل دھڑک دھڑک کر خوف کی دلدلی زمین میں دھنستا جا رہا تھا۔

اچانک ہی شام اسے بے حد ہولناک محسوس ہونے لگی۔ ہتھیلیوں سے پسینہ بہنے لگا۔ ج تو وقت بھی دھیرے دھیرے سرکتا محسوس ہو رہا تھا۔

ج رات بچل اسے پروگرام بتانے والا تھا۔ اور وہ اپنی ساری ہمتیں مجتمع کر رہی تھی۔ وقت کے جلدی گزرنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ اور عابدہ بار بار کمرے میں کمر اس کے اضطراب کو دیکھ کر چپ ہو جاتیں وہ سوچتیں اسے کیسے راضی کریں، اس سے کیسے بات کریں اماں نے انہیں کتنا مشکل کام سونپا تھا۔

زیمیل۔ بلا خزانہوں نے بات کرنے کی ٹھان لی۔

ہاں ادی۔ وہ وال کلاک سے نظریں ہٹا کر ان کی طرف دیکھنے لگی۔

تم نے بابا سائیں کے فیصلے پر کیا سوچا ہے پھر۔

وہ اس سے نظریں ملائے بغیر بات کر رہی تھیں۔ زیمیل کے لبوں پر زہر خند مسکراہٹ بکھر گئی۔

بابا سائیں نے سوچنے کی گنجائش ہی کہاں رکھی ہے ادی، وہ اپنے فیصلوں کی چھری سے

قتل کرتے ہیں، اور مرنے والے کی خری خواہش تک نہیں پوچھتے۔





وجہ سے وہاں نا جانا کم ہی ہوتا تھا دن میں بھی۔

ساتھوں۔ سچل کی واز بے حد ہلکی تھی مگر اس کی سماعتوں نے بخوبی سن لیا، وہ اندھیرے میں کھڑا تھا۔ مگر اس کا ہیولہ اسے نظر رہا تھا۔

ہاں، بولو سچل۔ اس نے چادر منہ پر ڈال کر جواب دیا۔

ج رات چار بجے تیار رہنا ہے، فجر کی اذان سے پہلے گوٹھ سے نکل جانا ہے شہر جانے والی بس اذان کے وقت ہی ملے گی نہیں تو سوزو کی تو مل ہی جائے گی۔

وہ دہلی زبان میں پروگرام بتانے لگا پھر فوراً ہی اللہ حافظ کہہ کر پچھلی طرف سے نکل گیا۔  
زیمیل کچھ دیر اپنی جگہ کھڑی اپنے دل کی حالت کو سنبھالنے لگی۔ پھر وہ بے واز قدموں سے واپسی کے لئے پلٹ گئی۔ مگر اس کی نظریں ستون کی پچھلی طرف ایک سائے کو دیکھ نہ پائیں۔

کمرے میں کروہ جھٹ سے اپنے بستر پر گر گئی عابدہ غسل سے فارغ ہو کر تویے سے بال رگڑتی باہر نکلی تھیں۔

ارے، ج تجھے بڑی جلدی نیند رہی ہے۔ اسے سر سے پیر تک چادر میں چھپے دیکھ کروہ نہیں۔ مگر وہ چپ رہی۔

سو گئی کیا؟ وہ خود ہی بڑبڑائیں پھر نائٹ بلب جلا کر، دوسری بتیاں بجھا دیں،

کمرہ یکلخت اندھیرے میں ڈوب گیا۔

بلکہ مدھم روشنی تھی جس میں ادی عابدہ کرسی پر بیٹھی اپنے سجیلے بال سلجھا رہی تھیں۔ یہ انکی عادت تھی، رات نہا کر وہ عشاء کی نماز پڑھتیں پھر جانے کتنی رات جائے نماز پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہتیں کبھی تو تسبیح کے دانے بھی نہ گرتے، اور وہ دور خلاؤں میں جانے کیا تلاش کرتی رہتیں۔

اسے تو اب بس ادی عابدہ کے سونے کا انتظار کرنا تھا۔

اس کے بعد اپنا سامان تیار کرنا تھا۔

پچل نے سیاہ چادر اوڑھے بڑی مشکل سے اس کی کھڑکی تک کر دستک دی تھی۔ مشکل اسے اس وجہ سے ہوئی تھی کہ وہ سیڑھیوں سے نہیں بلکہ چھجوں سے اوپر تک پہنچا تھا اور پچھواڑے لان کی طرف کھلنے والی کھڑکی تک یا تھا۔

دوسری دستک پر اس نے جھٹ کھڑکی کپٹ کھول دیئے۔ پچل نے نارنج کی روشنی میں

اپنا پ نمایاں کیا۔

ٹھیک ہے چلو۔

سائون۔ وہ ایک لحظہ کو گھبرا کر بولا اگر ایک بار اور سوچ لو تو۔

کیا سوچوں پچل، کیا اپنی موت قبول کرنے کے بارے میں۔ اس نے چادر میں خود کو چھپاتے ہوئے قطعیت سے کہا۔

میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہ بھولوں گی پچل، چلو اب جلدی کرو، ایسا کرو یہ تم اٹھا لو اور پچھواڑے میرا انتظار کرو میں تی ہوں۔ اس نے زیورات کی گٹھری پچل کو تھما دی۔





مسکراتے ہوئے بیڈ کی دراز سے سوکانوٹ نکال کر بھاگل کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

اتنی اچھی خبر لائی ہے، موتیوں سے تیرا منہ بھر دینے کو جی چاہتا ہے، چل نیچے تو بھی۔ وہ ہنستی کھٹکھٹاتی اس خوش سند خبر سے سرشار کمرے سے باہر بھاگی۔ اس کے پیچھے بھاگل لپکی۔

بڑے کمرے میں حویلی کی خواتین جمع تھیں۔ بڑی اماں ایک طرف مٹھائیوں سے بھرے تھاں ملازمہ سے رکھوا رہی تھیں۔ وہ سیدھی ان کی طرف ہی گئی۔

مبارک ہو اماں۔ اس کی کھٹکتی واز میں خوشی کی چھا جن بج رہی تھی۔ اماں نے اپنا چہرہ اس کی سمت موڑا اور بھر بڑی محبت سے اس کے جھکے سر پر ہاتھ پھیرا۔

خیر مبارک، اللہ ان خوشیوں کو نظر بد سے بچائے رکھے۔ یہ پہلی خوشی تھی جو حویلی کی خواتین کے چہروں سے بھی ظاہر ہو رہی تھی۔ وہ عابدہ اور زینت کے درمیاں کی خالی کرسی پر بیٹھ گئی۔ اسی دم وڈیرہ حق نواز اندر داخل ہوئے ان کے ہمراہ مہراں شاہ بھی تھا۔

بابا یہ مٹھائی وٹھائی ابھی تک تقسیم نہیں ہوئی؟ وہ اپنی مخصوص کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے مٹھائیوں سے بھرے ٹوکروں کو دیکھتے ہوئے بولے۔

بس ابھی رحیم اور بھاگی کو یہ کام سونپا ہے۔ اماں نے جواب دیا۔

ادا، گوٹھ والوں کو اس خوشی میں مٹھائی ملے گی، اور ہمیں کیا ملے گا؟ زینل اپنی جگہ سے اٹھ کر مہراں شاہ کی طرف گئی جس کا چہرہ نئے جذبوں سے چمک رہا تھا۔ اس کے لب پوں پ دھیمی مسکراہٹ سے واسطے۔







کک-----کیا ہوا، مہران خیر تو ہے ہٹ۔

خیر نہیں ہے اماں، تیری یہ دھی اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر بھاگ رہی تھی، ایک کمی کمین کی خاطر اس حرام زادے غریب سجادوں کے پاس، ہمارے نمک حرام ملازم بچل کے ساتھ، سنبالو اسے، میں تو اس کی چمڑی ادھیڑ دوں گا۔ وہ پھنکارتا ہوا۔ گے بڑھا اور بالوں سے کھنچتا کمرے کے فرش پر پھینکا اور اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

سلطان شاہ بھی سیڑھیاں پھلانگتا اپنے گاؤں کی ڈوریاں کستا کانپتا پہنچا اور راہداری میں لگی بھیڑ کے پاس ٹھہر گیا۔

عابدہ چیخ کر مہران شاہ کا بازو پکڑ کر اسے روک رہی تھیں۔  
بس کر ادابس کر، مرجائے گی۔

مر رہی جائے تو اچھا ہے یہ زندہ رہے گی تو ہماری عزتوں پر بٹالگاتی رہے گی۔  
سلطان شاہ نے شیر کی طرح پھرے ہوئے مہران شاہ کو کمرے سے پکڑ کر با مشکل پیچھے گھسیٹا۔

اگر اس نے اس کمرے سے قدم بھی نکالا تو میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔  
مہران شاہ نے برا بھلا کہتے ہوئے قبر برساتی نظریں اس کے بے حال سراپے پر ڈالیں جس پر عابدہ لیٹی ہوئی تھیں۔

بند کر دے اسے اسی کمرے میں۔





ہاں تمہیں چوری کے الزام میں جرگے کے حوالے کروں گا۔  
سائیں۔ بچل دم بخود رہ گیا۔

کیسے وڈیرہ حق نواز نے اپنی پگڑی کو سنبھالا دیا تھا۔ اپنی رسوائی کے ڈر سے اس پر چوری کا الزام رکھ کر اپنی خواہش بھی پوری کر لی تھی یعنی سانپ بھی مر جاتا اور لائچی بھی نہ ٹوٹتی۔ وہ بڑے لوگ تھے سب کر سکتے تھے چاہتے تو ابھی اور اس وقت اسکی قبر اس باغیچے میں بنا دیتے، مگر یہ وڈیرے لوگ کام بھی پکا کرتے تھے۔

کبھی یہی سچل جی حضوری کے ساتھ ان کے تمام حکموں کی تعمیل کرتا یا تھا۔۔۔۔۔

مگر ج وہ خود بے بس، وہ بے اختیار گڑگڑاتا رہتا اپنی زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔

صبح گوٹھ والوں پر یہ خبر بم کی طرح پھٹی کہ سچل حویلی میں زیورات کی چوری کرتے ہوئے پکڑا گیا۔ سب کمدار ایک دوسرے کو روک روک کر پوچھ رہے تھے۔ سچل کو پولیس کی بجائے جرگے کے حوالے کیا جانا تھا وہ اگر اپنا موقف بیان کرنے، اپنی صفائی میں کہنے کے بعد خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے اس انگاروں پر چلے اور اس کے پاؤں نہ جلیں۔ جب کہ اس فیصلے کی بنیاد ہی تھی کہ انگاروں پر چلنے والے دی کے پاؤں اگر جلیں گے تو وہ مجرم ہے بصورت دیگر وہ بے گناہ قرار دیا جائے گا۔

اور پھل اچھی طرح جانتا تھا کہ جرگے میں وڈیروں کے اپنے دمی ہی ہوتے ہیں ج  
تک انگاروں پر چلنے والا مجرم ہی گردانا گیا ہے۔ ننانوے فیصد لوگ مجرم ہی قرار پاتے ہیں اور

اس میں اسی فیصد لوگ مجرم ہوں یا نہ ہوں گ پر چلنے سے پہلے ہی اقرار جرم کر لیتے ہیں۔ اور ان کو سزا بھی سنائی جاتی ہے۔

پچل کو اگرچہ اس وقت چھوڑ دیا گیا تھا مگر بچنے کی کوئی راہ نہیں دی گئی تھی۔ پورا گوٹھ امداد علی کے گھر امنڈ یا تھا اور اس واقعہ سے بے حال کمینوں کو سنبھالنے لگا۔ بھلا میرا پٹ چوری کر سکتا ہے۔ اماں بین کر رہی تھی۔ وہ ان جرگے والوں سے اچھی طرح واقف تھا۔

باقیس گم صم تھی۔ وہ تو جانے کتنے خوبصورت رو پہلے خواب دیکھ چکی تھی، کتنی بار تصور میں سجاوہ اور زینل کو ساتھ ساتھ ہنستے مسکراتے شہر کی سڑکوں پر ہاتھ ڈالے گھومتا دیکھ چکی تھی۔ مگر یہ کیا ہو گیا اس بات کا تو وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی اس کا بھائی، نیکی کرنے پر سزا کا حقدار ٹھہرا تھا۔

نہیں نہیں، یہ سزا زینل کو ملے، میرے ادا کو کیوں۔ وہ پچل سے لپٹ گئی۔  
تو۔۔۔۔۔ تو بول، ہتا گوٹھ والوں کو کہ وڈیری خود بھاگ



بل قیس۔ پچل نے ایک تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

مجھے اتنا بچ نہ سمجھ، میں نے نمک حرامی کی سزا پائی ہے، وہ تو نیکی تھی اس کی جزا مجھے رب کے یہاں ملے گی، مگر سوچ، سوچ بلقیس ساڑن کے ساتھ کیا ہو گا وہ۔۔۔

تجھے اس کی فکر ہے مگر میرا دل پھٹ جائے گا ادا ہم تجھے کیسے گ پر چلتا دیکھیں گے یہ کیسے ممکن ہے کہ گ پر چلیں اور پاؤں نہ چلیں۔ بلقیس دھواں دھار رو رہی

تھی چل چار پائی پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا بس، سپاٹ چہرہ لئے ان تمام وازوں سے بے پرواہ گونگا بہرہ بن کر بیٹھا تھا مگر اس کا ذہن سوچ رہا تھا کہ سجاوٹ ہی کہتا تھا یہ جاگیر دارانہ رسمیں گوٹھ والوں کی جہالت سے قائم ہیں اب تک، اب وقت ہے لوگوں کا شعور بیدار کیا جائے، ان وڈیروں جاگیر داروں سے ٹکر لی جائے جہالت کے خلاف جہاد کیا جائے۔

ایک ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا بھی جہاد ہے۔ اور وہ ان وڈیروں کو سب کچھ ماننے والا ج خود ان کے ظلم کی لپیٹ میں تھا۔

وہ یہ معاملہ پولیس میں بھی دے سکتے تھے مگر اس طرح حویلی کی عزت پر حرف نہ بھلا چل زبان کیوں کر بند رکھتا۔

مجرم کو گ پر جلانے کی رسم برسوں سے چلی رہی تھی جو اس گوٹھ بلکہ معاشرے کی پسماندگی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

گوٹھ کے ان پڑھ جاہل اور معصوم لوگ نہیں جانتے تھے کہ جرگے کے سردار غیر جانبدار



کبھی نہیں ہے۔ جاگیردار کسی کو بھی مارنے کے لئے اسی رسم کا سہارا لیتے تھے۔ اور لوگ سمجھتے، انگاروں پر چل کر پاؤں جھلسانے والا حقیقتاً مجرم ہے، جو جانتے تھے سچ اور غلط کا فرق وہ بھی اپنی معاشی، سماجی مجبوریوں کے ہاتھوں چپ تھے۔

رسم کی ادائیگی دوسرے دن شام کو ہونا قرار پائی تھی۔ جرگے والوں کی طرف سے تیاریاں جاری تھیں۔

بڑے میدان میں ایک طرف شامیانے لگا کر کرسیاں ڈالی جا رہی تھیں، جیسے شادی کا کوئی موقع ہو، شامیانے کے عین سامنے ایک دس فٹ لمبا اور تین فٹ چوڑا گڑھا کھودا گیا تھا جس میں ابھی سے لکڑیاں ڈال ڈال کر گسلا گئی جا رہی تھی تاکہ کل شام تک گڑھا انگاروں سے دھبہ اٹھے۔ امداد علی اور اس کی بیوی حویلی کے باغیچے میں گڑگڑا رہے تھے مالکوں سے اپنے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ رہے تھے۔

کیا اتنی سی چوری معاف نہیں کی جاسکتی تھی سائیں۔ امداد علی کا بوڑھا وجود بے حال ہو رہا تھا۔ مگر مالک کے کارندے انہیں اندر جانے تک کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔

سائیں کا حکم پتھر کی لکیر ہوتا ہے امداد علی، بابا بابا یہاں سے، جان چھوڑ ہماری۔  
رحم کر سائیں، رحم کر۔ ماسی زرینہ فرش پر سر نکا کر بین کرنے لگی۔

ادی عابدہ نے اوپر سے یہ روح کو تھر ادینے والا منظر دیکھا پھر نظریں سامنے کھلے میدان پر پڑیں تو جھمر جھری لے کر کھڑکی کا پٹ بند کر دیا۔







تم بھی مٹھائی کھا لو جتنا دل چاہے۔

یہ کیا بات ہوئی، کچھ جیب ویب خالی کریں، ایسے کام نہیں چلے گا ادا۔

مجھے خبر تھی تو ضرور کچھ مانگے گی، مگر پہلے وڈی ادی کا حق ہے۔ اسے دیکھ کیسی صابر ہے۔

رکیں مہراں شاہ نے ازراہ مذاق اسے چھیڑا مگر جانے کیوں دل پر کھٹ سے کوئی وڈنی شے

لگی۔ دوسری طرف اون سلائوں میں ابھی عابدہ حق نواز کا جھکا ہوا سراو پراٹھا۔

ان کے لبوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ مگر غائب ہو گئی مگر مسکراہٹ ان کے سپاٹ

چہرے پر کوئی رقت پیدا نہ کر سکی۔

چلو تو پہلے ادی کا حق دے دو پھر مجھے۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلا کر کھڑی ہو گئی۔

عابدہ جھٹکے سے اپنی جگہ چھوڑ کر اٹھ گئیں۔

کیا کر رہی ہے زیے، جری ہے بھلا پیسوں کا میں کیا کروں گی۔ وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر

اسے سرزنش کرتی کمرے سے باہر نکل گئیں۔

خوشیاں چھڑکتے دل کی سرزمین سے پھوٹی ہیں۔ جذبے دل کی زندہ زمین سے ابھرتے

ہیں۔ مردہ دل، بنجر زمین پر صرف ویرانی اور سناٹے کے بول اگتے ہیں۔ جن کی چھین صرف

اس کو چھونے والا ہی نہیں بلکہ اس زمین کا سینہ بھی محسوس کرتا رہتا ہے جس کی سطح کو پھاڑ کر وہ

اگتے ہیں۔

عابدہ حق نواز کے دل کی زمین بھی ایسی ہی کھردری، بنجر اور سیم زدہ ہو چلی تھی جس میں

اماں۔ وہ ان کے سینے میں منہ چھپانے لگی۔ ادی عابدہ نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی زور سے بند کی اور اس پر پردہ گرا دیا۔

لے یہ پانی پی لے۔ اماں نے پانی اٹھا کر اسے دیا مگر اس نے ہاتھ ہٹا کر گلاس کو پرے کر دیا۔

مجھے معاف کر دے اماں، معاف کر دے۔ وہ اچانک سسک پڑی۔ اماں نے اس خود سے چمٹا لیا۔

شامیانہ کچا کھج بھرا ہوا تھا گوٹھ والے بھی چاروں طرف جمع ہو گئے تھے، بچل کو لایا جا رہا تھا، چار افراد گڑھے کے چاروں طرف پھیرنے لگا رہے تھے۔ پھر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ جرگے کے سردار گڑھے سے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔

بچل کا چہرہ ان ہی انگاروں کی طرح دہک رہا تھا۔ مگر اس پر کوئی تاثر نہیں تھا بس لال پتھرائی ہوئی نکمیں تھیں۔ اس نے تو امداد ملی، اماں اور بلقیس کے رونے کی وازوں پر بھی کان بند کر رکھے تھے۔ انہیں ایک طرف ان کے عزیز رشتہ دار سنبھال رہے تھے، اس نے بس نظریں اٹھا کر شامیانے کی پہلی رو میں گرہیوں پر تماشا دیکھنے والے وڈیرہ حق نواز اور مہراں شاہ کو دیکھا۔

(یہ گ تو تمہارا حق تھی وڈیرہ حق نواز) اس نے نفرت سے سوچا پھر کلمہ پڑھ کر انگاروں پر پیر رکھ دئے، لوگوں نے ایک ٹاپے نکمیں بند کر لیں۔

بلقیس تو وہیں غش کھا کر گر گئی تھی اسے دو عورتیں اٹھا کر لے گئیں۔

ان انکاروں پر پیر رکھتے ہی سچل کا سارا وجود ہی سلگ اٹھا۔ درد کی ٹیسیں انھیں جو رگ رگ کو چھیدنے لگیں۔ مگر اس نے انکاروں کا یہ سفر اپنی ہمت سے جاری رکھا۔ لوگ دم بخود رہ گئے تھے۔ کتنی سسکیاں کتنے نوحہ خیز میں اٹک گئے تھے۔

اسے جلدی سے دو دمیوں نے پکڑ کر ایک کرسی بٹھا دیا۔

وڈیرہ حق نواز اور رئیس مہراں شاہ بڑے مطمئن انداز میں بیٹھے تھے۔ جیسے ایک مداری نے دلچسپ تماشہ ان کے سامنے پیش کیا ہو۔ ابھی وہ قابل معافی نہیں ٹھہرایا گیا تھا اس کے پیروں کو بکری کے خون میں ڈالا گیا اس کے بعد دو پیروں کا جائزہ لیا گیا۔ اب کوئی معجزہ تو ہونی نہیں سکتا تھا کہ انکاروں پر چل کر بھی پیر بے داغ رہتے، وہاں بڑے بڑے بلے، ابھرے تھے۔ جلد پھٹ گئی تھی۔ جس کی اذیت صرف سچل ہی محسوس کر سکتا تھا۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اس کے دونوں پیروں کو اس کے جسم سے جدا کر دے۔ مگر وہ ضبط کے خری مراحل سے گزرتا رہا، ہونٹ بھینچے اس اذیت کو سہتا رہا۔

اس کے بلوں کو دیکھ کر جرگے والوں نے نیا سے مجرم قرار دے دیا۔ اور سزا سنانے کا دن کل پر رکھا گیا۔ مجمع ہستہ ہستہ چھٹ گیا۔ بس سچل کے یار دوست اس کے گرد جمع ہو کر اسے سنبھالنے لگے جواب طاقت کھو رہا تھا۔ نیم بے ہوشی اس پر طاری ہونے لگی تھی۔ رگ رگ سے ٹیسیں اٹھ کر ناقابل برداشت ہوئی جا رہی تھیں۔



سجاوِل شاہ غصے سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس کی شریانوں میں خون ابل رہا تھا۔  
سجاوِل جذباتی نہ بنو۔ علی احمد نے اس کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ تو اس  
نے غصے سے جھٹک دیا۔

علی احمد میرے بھائی پچل کو انگاروں پر چلایا گیا ہے۔ غلط مقدمے الزام لگا کر اپنی بیٹی کا  
جرم بھی اس کے سر تھوپ دیا اور سزا کے طور پر بابا سے ان کی ذاتی زمین چھین لی گئی، میرے  
اسکول کو گ لگا دی گئی اور یہ کہہ دیا گیا کہ رات گھا س پھونس میں گ لگ گئی، اور اب تم  
کہتے ہو میں جزباتی نہ بنوں، میں تو ان وڈیروں کی بوٹیاں نوچ لوں گا۔ وہ نفرت اور غصے سے  
پینا۔

صبح ہی فقیر محمد کا بیٹا رئیس اس کے پاس پہنچا تھا اور اسے وہاں کے تمام حالات سے باخبر  
کیا تھا۔

سجاوِل اس نوبت کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، غم و غصے سے اسکی منٹیاں بھنج گئی تھیں۔  
کنپٹیاں یوں تنی ہوئی تھیں۔ جیسے وہاں رگوں کی بجائے لوہے کے تار کا جال بچھا ہوا ہو۔ اس  
کے چہرے پر سرخی تھی جس میں ایک تکلیف دہ رنگ تھا۔ نکھوں میں خون اتر ا ہوا محسوس ہو رہا  
تھا۔

میں ج ہی تمہارے ساتھ گونڈھ چلتا ہوں۔ وہ ہنوز مشتعل سا کمرے میں چکرارہا تھا۔  
اس کا بھائی انگاروں کا سفر کر چکا تھا اس کا باپ اپنی زمین سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا اور وہ بے

خبر تھا اس کا دل دکھ اور غصے کے مشترکہ احساس سے سلگتی بجھتی بنا ہوا تھا۔

نہ، نہ سجاوِل تو گوٹھ نہ بنا ابھی۔ رئیس فرش سے کھڑا ہو کر اس کے سامنے کر گڑا یا۔

دماغ درست ہے تمہارا، اتنا بہت کچھ ہونے کے بعد تم کہہ رہے ہو میں گوٹھ نہ جاؤں

میرے گھر میں شعلے دہک رہے ہیں اور تم کہتے ہو، میں اٹھتے دھواں کا یہ کھیل دیکھتا

رہوں، یا یہاں بیٹھا گ کے بجھنے کا اور سب کچھ را کہ ہو جانے کا انتظار کرتا رہوں۔

اس نے اشتعال میں کر رئیس کو ایک طرف دھکیل دیا۔

تم اکیلے ان جاگیرداروں کا کیا باز لو گے۔ علی احمد نیر دی سنجیدگی سے سوال کیا۔

میں مہراں شاہ کی بوٹیاں کتوں کو کھلا دوں گا کچھ نہیں تو اس کے سینے میں گولیاں اتار کر

خود کو پولیس کے حوالے کر دوں گا۔

یہ تو اس وقت ممکن ہو گا جب مہراں شاہ تنہا، نہتا تمہارے سامنے لے گا۔

کیا مطلب۔ وہ علی احمد کی طرف گھوم گیا۔

مطلب یہ کہ، حویلی میں داخل ہونا کسی فلم کے ہیرو کے لئے تو سان بات ہو سکتی ہے مگر

حقیقت میں ہمارے تمہارے لئے نہیں، ہزاروں مسلح دمیوں اور خونخوار کتوں سے گزر کر ان

بڑے لوگوں کی اوطاق تک پہنچا جاتا ہے۔ ایسی حماقتیں کرو سجاوِل اس طرح کر کے سوائے اپنی

جان ضائع کرنے کے تم کچھ نہیں کر سکو گے۔

ہاں ہاں سجاوِل۔ گھبرایا ہوا رئیس سجاوِل کے شہری دوست کی بات کی تائید میں پر زور

انداز میں سر ہلانے لگا۔

مگر سجاول کے دل میں لگی گ ان جملوں سے نہیں بجھ سکتی تھی۔ اس کا تو ابھی اور اسی وقت گوٹھ جا کر مہراں شاہ کا خون پی جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے پھل تھا۔

سجاول، چاچا امداد علی نے مجھے سختی سے تاکید کی ہے کہ تمہیں کسی حال میں بھی ابھی گوٹھ نہ نے دوں، رئیس مہراں شاہ تمہارے رت (خون) کا پیسا ہے، اصل دشمن وہ تمہیں ہی تصور کر رہا ہے۔

رئیس نے کہا تو اس کے سختی سے بھیجنے ہونٹوں پر نفرت انگیز مسکراہٹ ریگ گئی۔  
وہ پھرا ہو شیر بنا پھر رہا ہے، یقین کرو سجاول۔

میں بھی تو اس کے خون کا پیسا ہوں۔ وہ دھاڑا۔

رحم کرو چاچا پر سجاول، انہوں نے کہا ہے سجاول سے کہنا اگر وہ گوٹھ لے تو وہ اپنے پ کو مار ڈالے گا وہ کہتے ہیں میں ایک بیٹے کے زخموں سے چور ہو گیا ہوں دوسرے کا غم سہہ نہ پاؤں گا۔ رئیس نے بلا خر چاچا امداد علی کی ساری بات من و عن سنادی کہ سجاول کو روکنے کے لئے یہ ضروری تھا۔

اس کی باتیں سجاول کے دل میں ترازو ہو گئیں۔ وہ کرسی پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔  
رئیس جھوٹ نہیں بولتا تھا اور بابا کے خوف اور کمزور اعصاب سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ اس



نے کرب کی شدت سے ہونٹ باہم بچھنچ لئے، اور سر جھکا کر پیشانی پر انگلیاں پھیرنے لگا۔  
 مگر کب تک ہم ظلم اور بربریت کے گے ہتھیار ڈالتے رہیں گے۔ کب تک دلوں پر  
 خوف کے پہرے ڈالے، لبوں پر قفل چڑھائے ایک بے کار، بے حیثیت شے کی طرح زندہ  
 رہیں گے کب تک خرکب تک۔ وہ کھوتا ہوا کرسی سے کھڑا ہوا سامنے رکھی تپائی پر لالت ماری  
 اور دوسرے کمرے میں چلا گیا علی احمد اور رئیس دونوں دنگرفتہ سے سر جھکائے بیٹھے رہے۔  
 شام کی بس سے رئیس واپس گونٹھ جارہا تھا سجادول نے اسے سرخ سرخ کئی نوٹ دیئے۔  
 یہ رکھ لو بابا، کودے دینا، بیٹھو ادھر۔ اس نے رئیس کو اپنے قریب ہی فرش پر بٹھا دیا۔  
 زبیل کے ساتھ کیا رویہ ہے وڈیرے کا۔ اس نے نگاہیں فرش پر جھکائے جھکائے  
 پوچھا۔

کون، وڈیری۔

ہوں۔

اللہ جانے حویلی کے اندر کا حال کون جان سکتا ہے سوائے رب کی ذات کے، یا خود انہی  
 لوگوں کے۔ رئیس نے گہری سانس لی اور اپنے بیگ میں رقم ڈالنے لگا۔ وہ کچھ دیر خالی نظروں  
 سے اس کے ہاتھوں کی حرکت دیکھتا رہا پھر خطرناکی انداز میں کھڑا ہو گیا۔  
 کس کس کو خبر ہے کہ زبیل گھر سے بھاگ رہی تھی۔

کسی کو نہیں، سچل نے صرف مجھے بتایا ہے اور ہاں ادی بلقیس کے علم میں بھی ہے۔ شاید

چاچا امداد علی اور ماسی تو یہی سمجھ رہے ہیں کہ پچل پر چوری کا جھوٹا الزام لگایا ہے۔ انہیں اصل وجہ نہیں معلوم، میں اب چلوں گا۔ وہ اٹھنے لگا۔

ہوں۔ سجاد نے ہنکارا بھرا۔ کیا پچل کی حالت بہت خراب ہے۔

نہ نہ تو فکر نہ کر اس نے انگاروں پر قدم رکھتے ہی اعتراف جرم کر لیا تھا اس لئے پیر پر ایک دھبہ ہی بلہ ہے۔ یہ جھوٹ بولتے ہوئے رئیس اپنے بیگ کی زپ کو بلا وجہ درست کرنے لگا۔ چاچا کی تاکید میں ایک یہ بھی تاکید تھی کہ اسے تفصیل نہ بتائی جائے پچل کی دیگر گوں حالت بھی چھپائی جائے۔

وہ گہرے رنج کے ساتھ خاموش کھڑا رئیس کو جانا دیکھتا رہا۔ بہت کچھ کرنے کی خواہش اور کچھ نہ کر سکنے کی بے بسی اسے اندر ہی اندر کاٹنے لگی۔

تم تو میرے اندازے سے کہیں زیادہ پاگل نکلیں زبیل۔ اس نے سلگتی نکھیں موند لیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم میری محبت میں یہ بھی کر گزرو گی۔

اس کا دل شدت کے ساتھ ایک نظر پچل اور زبیل حق نواز کو دیکھنے کے لئے تڑپنے لگا، جن دونوں نے محض اس کی محبت میں، خود کو گم میں جھونک دیا تھا۔

میں جانتا ہوں، بابا نے مجھ سے بہت کچھ چھپایا ہو گا علی۔ علی احمد کے ہاتھ کا لمس اپنے کندھے پر محسوس کر کے وہ دلگرفتگی سے بولا۔

بے تحاشہ ضبط کرنے کی کوشش میں اس کی پیشانی کی رگیں چٹخنے لگی تھیں۔ اس کی

نکاحیں یوں جل رہی تھیں جیسے ان کے اندر انگارے ڈال دیئے گئے ہوں۔

اگر ایسا کیا بھی ہے تو صرف تمہیں کسی غلط اقدام سے باز رکھنے کے لئے، تمہاری جان اتنی ارزاں نہیں ہے سجاو، اس کی بہت سے لوگوں کو ضرورت ہے اسے جاگیرداروں کی بھینٹ چڑھانا سراسر حماقت ہوگی اور انہی کے حق میں سود مند بھی۔

میں سوچ بھی نہیں سکتا علی کہ اتنا سب کچھ ہو جائے گا زینل نے مجھے اتنا تو بتایا تھا کہ اس کی سگائی اس کے چاچا کے نو سالہ بیٹے سے ہونے والی ہے، مگر جذباتی لڑکی اتنا بڑا قدم اٹھا لے گی میرے گمان میں بھی نہیں تھا، پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔

علی احمد نے اس کا سراپے سینے سے لگا لیا وہ اس لمحے کسی معصوم بچے کی طرح رنجیدہ تھا۔

کوئی چھاؤں ہو، جسے چھاؤں کہنے میں

دو پہر کا گمان نہ ہو

کوئی شام ہو جسے شام کہنے میں شب کا کوئی نشان نہ ہو

کوئی وصل ہو

جسے وصل کہنے میں ہجر کا دھواں نہ ہو

کوئی لفظ ہو، جسے لکھنے پڑھنے کی چاہ میں

کبھی ایک لمحہ گراں نہ ہو

یہ کہاں ہوا ہے کہ ہم تمہیں



کبھی اپنے دل سے پکارنے کی سعی کریں

وہیں رز و بے اماں نہ ہو

وہیں موسم غم جان نہ ہو

جذبوں کی بربادی رز ووں کی تشنہ کامی اور شکستہ حالی کے جس دور سے وہ گزر رہی تھی  
اور جوازیت قطرہ قطرہ پہنچ رہی تھی اس کا دل ہی جانتا تھا۔ اس نے گھٹنوں سے سر اٹھایا تو عابدہ  
کو کمرے میں موجود پایا۔

یہ کیسے سائباں ہیں ادی، جس میں چھید ہی چھید ہے کسی پناہ گاہ ہے، جس کی دیواریں  
ہی نہیں جہاں محبت تحفظ کے احساس کی بجائے ڈر خوف سینوں کی تہوں میں موجزن ہے۔  
ادی عابدہ نے الماری میں چابی ڈالتے ہوئے بس ایک نظر اس پر ڈالی۔

مجھے اس کمرے میں مقید کر کے مہران شاہ یا بابا سائیں یہ خیال کر رہے ہیں کہ میں بھی  
تمہاری طرح اپنے تمام جذبوں اور احساسات کو منجمد کر دوں گی، ایک مافی کا مادہ ہو بن جاؤں گی  
تو یہ ان کی بھول ہے یہ قید مجھے اور بھی باغی کر سکتی ہے۔

بس کر زبیل بس کر اللہ کے واسطے چپ ہو جا۔ عابدہ منتشر عصاب کے ہمراہ چیخ کر  
بولیں۔

جتنا تو رسوا ہو چکی ہے کیا یہ بہت نہیں ہے بابا سائیں نے اگر تجھے معاف کر دیا  
ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کبھی تمہاری خواہش پوری کر دیں گے، نہیں زیے اب ادا

کا ہاتھ تیرے چہرے پر نہیں اپنی بندوق پراٹھے گا۔ ان کا لہجہ التجائیہ ہوگا۔  
کیوں رکھا ہے مجھے اس کمرے میں قید۔ وہ چلائی کیا باڈیوں کی میں ان لوگوں کا۔ عابدہ  
نے گے بڑھ کر اس کا سراپے سینے سے لگا لیا۔

جو ہو گیا اسے بھول جا زیے اور اب جو وہ چاہتے ہیں سمجھ تقدیر کا لکھا یہی ہے اسے ہی  
مان لے۔ میری ماں، اسے مان لے تو، ہم بہت کمزور ہیں خواہشوں کے حصول لئے لڑنا  
ہمارے بس کی بات نہیں ہماری رزومیں ہمارے خواب خود ہمارے لئے زنداں بن  
جاتی ہیں۔

صرف ایک تو ہی نہیں لئے گی ہم سب برباد ہو جائیں گے۔ سجاوٹ مرد ہی زیمیل، اور مرد  
نارسانی کا غم زیادہ عرصے نہیں پالتا۔ اس نے سرائٹا کر بھیگی بھیگی نکھوں سے عابدہ کو دیکھا پھر  
ان سے الگ ہو گئی۔

ایک بات پوچھوں ادی۔ اس کا چہرہ دکھ رہا تھا۔  
سچل کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اس کا سوال بڑا غیر متوقع تھا۔ عابدہ گڑبڑا کر فرش سے اٹھنے  
لگیں۔ مگر زیمیل نے ان کے کندھے پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر ان کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔  
نہیں ادی، تجھے میری قسم مجھے سے کچھ نہ چھپاؤ میں نے دو دن دو راتیں بے خبری میں  
کاٹی ہیں مجھے تو اب ہوش یا ہے جب سے میرا چین اٹھ گیا ہے، وہ بے قصور تو میری وجہ سے  
ادامہ ان جیسے درندے کا شکار ہوا ہے بتا ادی۔ بول نا۔ وہ اسے جھنجھوڑنے لگی۔

اب کوئی خوشی کی کوئیل نہیں پھوٹ سکتی تھی۔ بس سم تھی وہ وہ سب میں بیٹھ کر نبھا چکی تھیں۔  
رشتوں کے تقاضے تھے جو وہ پورے کر رہی تھیں۔ وڈی اماں کی خوشی کے احساس کا پاس تھا جو  
ادا کر رہی تھیں۔



ادی خفا ہو گئیں تم؟ وہ رات اپنی اور اس کی مشترکہ خوابگاہ میں وسیع بیڈ پر بیٹھ کر اس کی  
گردن میں بازو حائل کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

نہ ماں میں، کیوں تجھ سے خفا ہونے لگی۔ عابدہ نے سے خود سے لپٹا لیا۔ حویلی میں ایک  
زیمل ہی تھی جسے وہ ٹوٹ کر چاہتی تھیں۔ شاید اس لئے کہ۔۔۔۔۔ اس کے اور زیمل کے دکھ  
سا جھے تھے۔ وہ بھی بے حیثیت، بے اختیار وہی تھی اس کی طرح۔

محبت کا جذبہ ہمدردی سے گلے مل کر اور بھی شوریدہ اور مضبوط ہو جاتا ہے۔

بلیقیں نے بہت خوبصورت گلے بنائے ہیں، بڑی محنتی لڑکی ہے۔ اس نے اس کے اگلے

کسی سوال سے پہلے ہی حفظ ماتقدم کے طور پر موضوع کو نیا موڑ دے دیا۔

ہاں ادی وہ خود بھی بہت اچھی ہے، ایک اور بھیجے گی۔ اس نے کہا تھا، کل شام تک بھیج  
دے گی۔ پ کو پسند آئے؟ وہ اس سے الگ ہو کر پوچھنے لگی۔





اس نے پتھرائی ہوئی نظروں سے نے والوں کو دیکھا۔  
پھر بیڈ کے کنارے ڈھے گئی۔ یہ خبر اس کے دل کو بھاری کر گئی تھی۔  
(تو کیا وہ اب ساری عمر سجاوِل اور بلقیس کو نہیں دیکھ سے گی۔)  
ماں صدقے دھی رانی لے چاچی اس کے بلائیں لینے لگیں۔  
مجھے خبر ہوئی تو میں دوڑی چلی ئی اے بھابھی یہ تو بہت کمزور ہو گئی ہے کوئی  
علاج کروایا ہے کہ نہیں۔

نہیں میں ٹھیک ہوں اب۔ اس نے سخت بے دلی سے چاچی کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا  
دیا۔ جسے انہوں نے شاید محسوس ہی نہ کیا۔

ارے کہاں رہ گئی، یہ اللہ رکھی، تھاں اس کے ہاتھ میں ہے خیر سے دونوں چھوڑیاں  
(لڑکیاں) بھی نے کو مچل رہی تھیں۔ پر میں نے روک دیا میں تو خود ابھی یہ رسم نہیں کرنا  
چاہتی تھی بھابھی، پر زبیدہ کے ابا زور دے رہے تھے میں تو زیمل پجڑی کے صحت مند ہو جانے  
کا انتظار کر لیتی پر، مہراں پٹ کو لگتا ہے بہت جلدی ہے کہہ رہا تھا چاچی کہ سگائی کے ساتھ ہی  
نکاح ہو جائے تو زیادہ سیٹھا ہوگا۔

لو دیکھو ذرا اتنی جلدی کی کیا ہے، کون سے ہم بھاگے جا رہے ہیں میں تو کہتی ہوں  
دھیرے دھیرے کام بنائوں گی کیوں پجڑی عابدہ۔ چاچی اپنا لش پش کرتا دوپٹہ سر پر جما کر  
ہنس ہنس کر بول رہی تھیں۔

اللہ رکھی اندر داخل ہوئی جس کے ہاتھ میں بڑا ساتھال تھا جو مختلف چیزوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسکے پیچھے رئیس مہران شاہ بھی داخل ہوا۔

بسم اللہ کرو چاچی۔ مہران شاہ ایک طرف پشت پر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور زمیل پر نظریں ڈالیں جو پتھرائی ہوئی نکھوں سے سب کو دیکھ رہی تھی پھر اس کی نظر اللہ رکھی کے ہاتھوں میں رکھے اس تھال پر جم گئیں جس میں رکھا سرخ اور سبز کا مادہ دو پٹہ چاچی اٹھا کر کھولنے لگیں پھر بسم اللہ کہہ کر اسے اوڑھا دیا۔

اللہ میرے اکبر کی زندگی وڈی کرے میری دھی رانی تو جگنی کیسی پیاری لگ رہی ہے۔ وہ جگمگاتے دوپٹے کے بالے میں دمکتا اس کا چہرہ تھوڑی سے اوپر اٹھا کر محبت پاش نظروں سے دیکھنے لگیں۔

زمیل حق نواز کے سر پر تو جیسے ہیمن ٹوٹا تھا۔ اس کی نظریں اماں پر اٹھیں جو اس کے چہرے کے تاثرات کو جانچ رہی تھیں۔ پھر اس نے مہران شاہ کو سلگتی نظروں سے دیکھا جو کسی فاتحہ کی طرح اس کا روئی کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

چاچی اب اس کی پیشانی پر ٹیلیہ (چاند کا نشان) بنا رہی تھیں پھر مٹھائی نکال کر اماں کے منہ میں ڈالی تھوڑی سی انہوں نے کھائی باقی مسکرا کر مہران شاہ کی طرف بڑھا دی۔

اور چند سو سو کے نوٹ نکال کر زمیل کے سر پر پھیر کر اللہ رکھی کو تھما دیئے۔ جس کی بانجھیں اتنے نوٹ پا کر کھل اٹھی تھیں۔



دھی رانی کے نصیب اللہ سے کرے، تہذہن رئیس کو خوشیاں دکھائے۔ وہ دعائیں دینے لگی۔

بل بل بہت ہو گیا۔ چاچی نے ہنس کر اس کے شانے پر ہاتھ مارا تو وہ جلدی سامان سمیٹ کر باہر نکل گئی۔ اس کے ساتھ اماں اور چاچی بھی چلی گئیں۔  
بابا ساکین نے تجھے بچہ سمجھ کر معاف کر دیا ہے بابا تو نادان ہے اپنے اچھے برے کو نہیں سمجھتی ابھی۔

اس نے نفرت سے تمنا کی نظریں مہران شاہ پر اٹھائیں پھر جھکا دیں اس صدمے سے اس کی قوت گویائی ہی سلب ہو چکی تھی۔  
کو اسب سے اونچے کنگورے پر بیٹھنے سے بھی عقاب نہیں بن سکتا، یہ کمی کمین ہمارے اسٹینڈرڈ کے نہیں ہیں، پیر کی جوتیاں، پیروں میں ہی سیٹی لگی ہیں۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے جھکے سر پر پھیرنے والے انداز میں رکھا۔

ادی اسے ٹھنڈا پانی دانی پلاؤ، یہ اب ٹھنڈے دل سے سوچے گی تو، اسے ہم دشمن نہیں دوست لگیں گے۔ وہ عابدہ کو حکم دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔  
زیمل۔ عابدہ جو اس تمام عرصے میں چپ سادھے کھڑی تھیں۔ مہران شاہ کے جاتے ہی اس کے پاس دو زانو ہو کر بیٹھ گئیں۔

زیمل کے لبوں کی تراش میں بڑی اعصاب شکن مسکراہٹ ابھر کر ٹوٹ گئی، اس نے

دو پٹہ سر سے نوچ کر پھینک دیا اور پیشانی سے ٹیلیہ کا نشان رگڑنے لگی۔

اگر زادی اور افلاس؛ یک حالت اور غلامی مگر خوشحالی کی حالت میں کسی ایک کے انتخاب کے لیے کہا جاتا تو ہر بالغ عاقل، زادی اور افلاس کی حالت کا انتخاب کرے گا، ہونہ کس نے کہہ دیا ہے کہ دولت کے انبار پر خوشیاں ملتی ہیں کس نے کہہ دیا کہ وڈی اور اچھی حویلیاں خزشی اور ابنساط کی ضمانت ہیں، جیلی جتنی بھی وسیع و عریض ہو، جیل ہی کہلاگی۔

ایک چھوٹا سا جھونپڑا اس کے سامنے پھر بھی خوشی و طمانیت کا باعث ہے اس لیے کہ وہ زادی کا منبع ہے وہ زادی کا نام ہے۔

وہ بڑے تحمل سے یہ سارا کچھ سہہ گئی تھی۔ دل پر گزرتے عذاب کی پذیرائی بڑے تحمل سے کر گئی تھی اور اماں اور عابدہ کے لیے یہی بہت تھا کہ اس نے چاچی کے سامنے اس کی عزت رکھ لی تھی۔

عابدہ نے غسل خانے کے دروازے پر نگاہ ڈالی جہاں وہ جا کر بند ہو گئی تھی پھر ایک گہرا سانس کھینچ کر اعصاب ڈھیلے چھوڑ دیے۔

کچھ بھی تھا ایک بوجھ سرک گیا تھا، ایک مرحلہ حویلی کی عورتیں باعزت طریقے سے گزار چکی تھیں۔

جس طرح دو ستارے

جو بظاہر پاؤں لگتے ہیں

مگر ان کی رفاقت میں

کروڑوں میل کی تنہائی کا دریا بھی ہوتا ہے

یہ دریا پار کیسے ہو

نہ تم ہو اس کنارے پر

نہ ہم ہیں اس کنارے پر

سو بہتر ہے ہم اپنے اپنے دائروں کے اس خلا میں گھومتے جائیں

ستاروں کی طرح اک ساتھ چمکیں دیکیں تو سہی لیکن یہ اپنے بچ میں جو فاصلوں کا سرخ

دریا ہے

اسے تسلیم ہی کر لیں

کہ اس بے پل کے دریا میں

نہ تم ہی تیر سکتے ہو، نہ ہم ہی تیر سکتے ہیں۔

وہ کھلے لان میں چلی گئی۔ ولایت چاچا کے بیٹے اکبر رئیس کے نام کا دوپٹہ اوڑھنے کے

بعد اس حویلی میں گھومنے پھرنے کی اجازت تھی۔

ملگجا اندھیرا ہر سو پھیلا ہوا تھا اس نے نگاہ پورخ کی طرف کی جہاں سیاہ بحیرہ کھڑی تھی

مگر اب چل نہیں تھا جو کپڑا ہاتھ میں لیے جم چماتی اس بحیرہ کو اور بھی چمکا تا رہتا تھا۔

پتا نہیں چل میرے گناہ کی کیا سزا پارہا ہوگا ادا مہراں نے جس طرح چل کی طرف دیکھا



تھا اس سے تو لگتا تھا وہ اسے قتل کر دے گا۔

وہ منظر نگاہوں میں گیا تو اسے جھرجھری گئی۔ سنسناتی گولی کیواز، پھر ادا مہراں شاہ کا چانک جانا یہی لان تھا یہی حصہ اور یہی دو قدم پر دیوار تھی جسے پھلانگ کر جانا تھا۔  
ہمگروٹی کہاں کند۔ اس نے بڑے کرب اور بھڑکی سے اس دیوار تک کا فاصلہ ناپا۔  
کتنے قریب ہو میرے دل سے سجاو، مگر کتنے دور ہو۔

اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے ماتھے پر گیا۔ بھوؤں کے درمیان ٹیلیہ کا نشان اس نے رگزرگ کر مٹایا تھا، مگر نشان مٹا دینے سے یہ رشتہ تم نہیں توڑ سکتی تھی۔  
نوسالہ رئیس اکبر جسے وہ کبھی گودوں میں اٹھا کر کئی چکر دے ڈالتی تھی۔ چاچا کے گھر جاتی تو اس سے خوب چھیڑ چھاڑ کرتی وہ ہمک کر اس کی گود میں چڑھ بیٹھتا تھا۔  
اوف۔ اس کی نکھیں درد سے پھر بھرنے لگیں۔

اس سے تو بہتر تھا ادی عابدہ کی طرح اس کا حق بخشو ادیا جاتا تنہائی میں ساری تکلیف وہ سوچیں اس کے اعصاب کو بری طرح منتشر کر رہی تھیں۔

اسے لگ رہا تھا وہ پاگل ہو جاگی کوئی اسے سجاو کی خبر نہیں دے رہا تھا۔ کوئی اسے نہیں بتا رہا تھا کہ چل کس اذیت میں ہے۔

وہ اجرک شانے کے گرد پھیلا کر اندر چلی نئی راہداری سے گزرتے ہو خری کنارے پر اس کے قدم ٹھہ گئے۔ وہاں بڑے بڑے شیشوں کی دیوار کے قریب مہراں شاہ کھڑا موہاں

پر کسی سے باتیں کر رہا تھا۔

یوں تو اسے اس کی باتوں سے کوئی سروکار نہیں تھا اسے تو اب اس حویلی ہی سے کیا خود اپنے پ سے بھی دلچسپی نہیں رہی تھی مگر جانے کیوں اس کے قدم ٹھہ کر رک گئے۔

ہاں ہاں بابا اس امداد غلی کے چھو کرے سجاول کی بات ہی کر رہا ہوں جو شہر میں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنی مونچھوں کو سہلا رہا تھا۔ وہ موٹے سے ستون کی رڑ میں ہو گئی۔

اچھا تو مجھے اس کا ایڈریس بتا دو میں اسے زیادہ دن زندہ نہیں دیکھنا چاہتا، کل ہی بندے بھیجتا ہوں۔

کہاں اواچھا۔ وہ زور سے ہنسی زبیل کے دل میں تیر کی طرح پوسٹ ہو گئی۔  
کیا پوچھتے ہو بابا بچل تو اب اپنے جھلے ہو پیروں کو لیے پڑا ہے، دیکھنا تو میں سجاول کو بھی ایسی حالت میں چاہتا ہوں پر۔۔۔

وہ لڑکا اتنا سیدھا نہیں ٹیڑھا ہے ذرا، یہ کمی کمین پڑھ لیتے ہیں بابا تو یہ خود کو مالکوں کے برابر خیال کرنے لگتے ہیں۔

اچھا سنو چھوڑا (لڑکے) میں اللہ وسایو اور دینو کو بھیج رہا ہوں شہر، تم اسے سجاول کا ٹھکانہ دیتا۔ باقی کام وہ سنبھال لیں گے۔

نہ نہ فکر نہ کرو تم پر کوئی نچ نہیں آئے گی۔ ارے بابا ہم کبھی کچا کام نہیں کرتے یہ کیس ویس نہ گوٹھ میں چلتے ہیں نہ شہر میں چلنے دیتے ہیں۔

ٹھیک ہے میں ابھی دمیوں کو تیار کروا کر روانہ کر دیتا ہوں میرا خیال ہے جو کام رات میں ہو سکتا ہے وہ دن کی روشنی میں نہیں۔

اس نے موبائل بند کیا اور پلٹا تو ایک لمحہ کو شپٹا گیا۔

زیمیل لال نگھوں کے ساتھ اس سے ذرا فاصلے پر کھڑی تھی اور وہیں رکھی اس کی وق پر ہاتھ رکھ دیا۔

کس کس بیگناہ کا خون بہاؤ گے ادا ایک اپنے طاقتور ہونے کے زعم میں، یہ زندگی بس یہیں تو ختم نہیں ہو جاگی اس کا حساب چکانا ہوتا ہے۔

مہران شاہ کی گفتگو نے اس کے اندر کی چنگاریوں کو ایک بار پھر گگ کاروپ دے دیا تھا۔

وہ سجاول کی موت کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا اور زیمیل حق نواز کے اندر ٹوٹے حوصلے ایک بار پھر توانا ہو کر مزاحمت کو گ بڑھے جیسے سجاول کی موت کا، بڑ خود اس کی موت کا نامہ تیار ہو چکا ہو۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ اب اپنے سود و زیاں سے بی نیاز ہو چکی تھی، اس کے لیے اپنی موت کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ اس لمحے بھی اس کے اندر مہران شاہ کا نہ خوف تھا نہ اپنی موت کا بس اس کی سماعتوں نے جو سنا تھا، وہی حاوی تھا۔ اسے صرف اور صرف مہران شاہ سجاول کی موت کا پیام برد کھائی دے رہا تھا۔



اس کے خوابوں کا دشمن اس کے جذباتوں کا قاتل۔

اور پتا نہیں کس کس کے قتل کا حساب اس پر نکلتا تھا۔

تم یہاں کیا کر رہی ہو، ہوش میں رہو۔ رئیس مہراں شاہ اپنی حیرت سمیت غصے سے اس

کی جانب بڑھا۔

اگر سب کچھ من ہی چکی ہو تو، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، جاؤ اپنے کمرے میں۔ اس نے اپنی

رائفل ٹیبل سے اٹھانے کو ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ زمیل نے اس پر اپنے دونوں ہاتھوں کا دباؤ

بڑھا دیا۔

نہیں ادا نہیں، میں تمہیں ایسا ہرگز نہیں کرنے دوں گی۔ اس کی وحشت بھری نظریں

مہراں شاہ پر جمی رہیں۔

میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ پھل کے ساتھ تم لوگ یہ کر گزرو گے، جبکہ وہ ہی قصور تھا۔

جرم میرا تھا وہ تو مالکین کا حکم بجالانے کا پابند تھا۔ میرے حکم کی تعمیل کی تھی اس نے تو بس تم

لوگوں نے اسے اس کی تابعداری کی یہ سزا دی۔ اسے انگاروں پر چلا دیا۔ اس جھوٹی رسم کی

بھینٹ چڑھا دیا، میرے خدا۔ اس کی نگہوں میں رنج سے نسو گئے۔

بکو اس نہ کر زیادہ۔ مہراں شاہ کے لئے ہاتھ کا تھپڑ اس کے منہ پر پڑا وہ لڑکھڑا کر

ہیچڑے ہوئی۔ پھر لپک کر اس نے بندوق پکڑ لی۔

نہیں ادا، میں بیگناہ سجاوٹ کا خون نہیں کرنے دوں گی تمہیں، اگر اسے مارنا ہے تو پہلے

ہاں پسند کیوں نہ نہیں گے، اتنی محنت سے بنائے ہیں اس نے۔ انہوں نے ہیکلہ اونچا کر  
کیا اس پر پشت نکالی اور بڑے بڑے چمکتے سنہری ویزے دوپٹے کے کنارے سے نکال کر  
ٹھیک کر کے دوپٹہ کان کے پیچھے ڈال لیا۔ پھر گوری کلائیوں میں کھنکتی درجن بھر چوڑیوں میں  
سے ایک چوڑی اتار کر زمیل کی طرف بڑھائی۔

یہ اسے دے دینا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں زمیل کہ ہم بھی غریب ہوتے، زاد اپنی منشا اپنی  
صلاح سے زندگی گزارنے والے، ذرا ذرا سی بات پر خوش ہونے والے۔ پر کہاں، اتنے  
بھاری بھاری طوق ہمارے گلے میں ڈال دیئے گئے ہیں۔ ان کی انگلیاں اپنی کلائیوں میں  
بجتی چوڑیوں پر پھرنے لگیں۔

تم بھی ادی ایسے ہی سوچتی ہو، میرے طرح سے۔ پر سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ دل جلتا  
ہے، روح کڑھتی ہے۔ وہ ان کے ہاتھ سے چوڑی لے کر اٹھ گئی۔

ہاں تو ٹھیک کہتی ہے، روح جلی ہے بس۔ انہوں نے گھٹنے پر ٹھوڑی نکالی۔  
میں نے بلیقے کے لئے کچھ اور چیزیں بھی نکال رکھی ہیں۔ وہ ایسے نہیں لے گی، اس کی  
بات پکی ہونے والی ہے اسی بہانے دے دوں گی۔

عابدہ نے موندی پلکیں کھول کر اسے دیکھا مگر بولی کچھ نہیں۔ وہ کمرے سے چلی گئی تو  
انہوں نے دوبارہ سابقہ انداز میں گھٹنے پر جھکا لیا اور سلگتی پلکیں موند لیں۔

قضاے دل پر ادا سی بکھرتی جاتی ہے

میرے خون سے تمہارا ہاتھ رنگیں ہوگا۔

اس پر جیسے دیوانگی طاری ہو گئی۔ مہراں شاہ اپنی جگہ ششدر رہ گیا۔  
وہ کھل کر سجاوے کی حمایت کر رہی تھی۔ وہ قید میں رہنے سے بجا دینے کے اور نڈر دکھائی  
دے رہی تھی۔

کیا کرو کی تم، کیسے رو کو گی مجھے بھلا۔ وہ مونجھوں پر ہاتھ پھیرتا دو قدم اس کی  
طرف بڑھتے ہواستہزاسیہنسا۔

ہاں میں جانتی ہوں میں ایک پپس لڑکی تم ظالموں کو کسی بھی اقدام سے بھلا کیسے روک  
سکتی ہوں۔ تم لوگ برس ہا برس سے لوگوں پر ظلم دھاتے ہو۔ کوئی تمہیں روکنے والا نہیں ہے  
گوٹھ کی بیگناہ معصوم لڑکیوں کی عصمت سے کھیلے ہو اس لیے کہ مہراں شاہ کوئی تمہارا گریبان  
پکڑنے والا نہیں سب تمہارے مزار سے تمہارے غلام ہیں۔ جھوٹے مقدمات میں ان معصوم  
لوگوں کو انگاروں جیسی رسموں کی بھیٹ چڑھا دیتے ہو۔ لوگ سچ جھوٹ کا فرق سمجھتے ہو بھی  
بولنے اور تمہیں روکنے سے قاصر ہیں۔

میں بھی۔۔ میں بھی اتنی ہی پپس ہوں، زیادہ سے زیادہ خود کو ہی گولی مار سکتی ہوں۔ یا  
تمہیں۔ اس نے جھپٹ کر بندوق اٹھالی اور دو رہٹ گئی مہراں شاہ کا دل پوری قوت سے دھڑکا  
اور خوف کی دلدلی زمین میں دھنسنے لگا۔

اس کا چہرہ خطرناک حد تک سرخ اور سرد تھا وہ اس لمحے کچھ بھی کر سکتی تھی، خود کو یا پھر اسے



ہی گولی مار دیتی، اس کی انگلی ٹرائیگر پر ٹھہری تھی۔

پاگل ہو گئی ہو کیا یہ تم کیسی باتیں کر رہی ہو۔ لاؤ بابا لاؤ یہ بندوق ادھر دو، یہ بڑا خطرناک کھلونا ہے چری۔ اس نے پچکار تے ہو اس کی جانب ہاتھ بڑھایا دوسرے لمحے بندوق پر اپنی گرفت کر لی۔

نہ ادا، میں خود کو مار سکتی ہوں نا اس جہنم سے نجات تو پا سکتی دس۔ چھوڑ ادا میں کہہ رہی ہوں دور ہٹ جا۔ وہ چلانے لگی اور دونوں ہتھیلیوں سے بندوق پر زور لگانے لگی۔ ادھر سیڑھیوں سیاتر تا سلطان شاہ اپنی جگہ حیران و پریشان رہ گیا۔

زیمل میں کہہ رہا ہوں چھوڑ دے بندوق۔ مہران شاہ نے پورا زور لگا کر بندوق کا اگلا حصہ اپنی طرف کھینچا، اور دوسرے ہاتھ سے اس کے ہاتھ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی دم دھماکا ہوا۔

اسی چیننا جھپٹی میں ٹائیگر پر دباؤ پڑا اور نال سے سنسناتی گولی نکل کر مہران شاہ کے ماتھے میں داخل ہو گئی خون کا فوارہ ابل پڑا۔ اونچا لمبا مہران شاہ پیچھے کی طرف لہرایا اور فرش پر ڈھیر ہو گیا۔

ادا۔ یہ سب اتنا نا فانا ہوا تھا کہ زیمل کے اعصاب چیخ گئے اس کے ہاتھ سے بندوق گر گئی۔ اس کے طلق سے نکلنے والی چیخ اس دھماکے سے کہیں زیادہ لرزہ خیز اور تیز تھی۔

ادا۔ مہران ادا۔ خوف اور حیرت اس کو ساکت کر گئے۔

اس کے سامنے اس کا بھائی نجس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے ماتھے نکلتا خون اس کے تئے ہو چہرے پر گلکاریاں کرتا جا رہا تھا۔

ادا، مہران شاہ۔ وہ دوزانو فرش پر اس کے قریب دھے گئی اس کی نکھیں خوف، دکھ اور وحشت سے ابلی پڑ رہی تھیں، اس کا لرزتا ہاتھ مہران شاہ کے ماتھے کی طرف بڑھا۔

زویل۔ اپنے شانے پر سلطان شاہ کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے وہ اچھل پڑی، اس کا بدن لرزنے لگا، وہ سلطان شاہ کو خوف اور دہشت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

زویل اٹھ جلدی کر بھاگ جا یہاں سے۔ وہ اس کے شانے پر دباؤ ڈال کر اسے کھڑا کرنے لگا۔

سلطان یہ یہ۔ وہ اٹھتے ہو کر کھڑائی، اس کے ہونٹ کاپنے لگے۔ پورے بدن پر لرزہ طاری تھا۔

یہ یہ خون مم میں نے نہیں کیا سلطان، میں تو۔۔ دیکھو دیکھو ادا زندہ تو ہے نا۔

میں کہہ رہا ہوں تو پہلے یہاں سے چلی جا، جا اپنے کمرے میں، میں دیکھتا ہوں، بابا سائیں تے ہوں گے۔ وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے، جا جازویل۔ وہ خود بھی ادا اس ہو رہا تھا ایک طرف مہران شاہ خون میں لت پٹ پڑا تھا۔ دوسری طرف بابا سائیں گے جانے اور زویل کی زندگی خطرے میں پڑ جانے کا خوف تھا۔

بھلا بابا سائیں کب یہ دیکھ سکیں گے کہ مہراں شاہ کو خون میں نہالنے میں زیمیل کا کتنا ہاتھ ہے وہ تو اپنے بیٹوں کی طرف بڑھتے ہاتھوں کو کاٹ دیا کرتے تھے۔ اور پھر ویمل جو بیٹی تھی وہ کسی صورت میں بیٹے کے مقابلے میں اسے رعایت نہ دیتے۔

میں نے یہ خون نہیں کیا، ادا۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر سسکیاں دبا ہوئی بولی۔  
سلطان اسے مہراں شاہ کے پاس سے دھکیل کر خود جھک کر اس کی دھڑکن سننے لگا، پھر ویمل کی طرف دیکھ کر عجیب سے احساسات کے ساتھ چیخا۔  
میں کہہ رہا ہوں جاتو، اپنے کمریہ میں۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی مگر بابا سائیں دوسرے ملازموں کے ہمراہ تیز تیز قدموں سے راہداری میں چلے۔ وہ گولی کی وازن کر بھاگے تھے۔

زیمیل سسکیاں دباتی سیڑھیوں کی طرف بڑھ رہی تھی، بابا سائیں کو دیکھ کر اس کے جسم میں خوف کی سرد لہر اٹھی، مگر وہ رکی نہیں اور سسکیاں دباتی اوپر سیڑھیاں پھلانگ گئی۔

کچھ ہی دیر میں حویلی میں شور برپا ہو گیا سارے ملازمین یہاں سے وہاں دوڑتے چلے۔ مہراں شاہ کو خون میں لت پت دیکھ کر عورتوں کی چیخیں نکل گئیں۔

یہ یہ کیا ہو گیا میرے پٹ (بیٹے) کو سلطان۔ بابا سائیں حیرت اور غم سے دنگ رہ گئے۔  
ہمت کریں بابا سائیں۔ سلطان نے انہیں تسلی دے کر ملازموں کے ہمراہ مہراں شاہ کو اٹھا کر گاڑی میں لٹایا اور ہاسپٹل پہنچ گیا۔



پیچھے بابا سائیں بھی اپنی جیب لے کر تیزی رفتاری سے چلے۔

اس وقت کسی کو سوال و جواب کی فرصت نہیں تھی۔ غم کا ایک پہاڑ ٹوٹا تھا۔ اماں تو وہیں غمش کھا کر زینت کی بانہوں میں جھول گئی تھیں۔

ادھر زیمل ہانپتی کانپتی اوپر نی اور دھپ سے دروازہ بند کر کے اس پر چٹخنی لگا دی اس کے پورے بدن پر ابھی تک ارتعاش طاری تھا، اور اعصاب پر سناٹا طاری تھا، من من بھر کے ہوتے ہو پاؤں کو بامشکل گھسیٹتی بیڈ تک نی۔ مگر بجا بیڈ پر بیٹھنے کے وہیں قریب قالین پر گئی۔ اسے دو قدم چلنا دو بھر ہو رہا تھا۔

اس نے گھٹنوں میں سر گرالیا اور کب کے ر کے نسو پورے زور و شور سے بہانے لگی جو کبھی گمان میں بھی نہیں تھا وہ سب ہو چکا تھا۔ جس کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی وہ بس کچھ ہو گیا تھا۔

وہ ہستکی سے انھی اور دروازے کی چٹخنی گرانی چاہی مگر اس کا ہاتھ لرز کر پہلو میں گر گیا۔

نہیں نہیں بابا سائیں مار ڈالیں گے۔ اس کی نگاہوں میں بابا سائیں لہرانے لگے۔

وہ سیڑھیوں کی طرف لپک رہی تھی، وہ دیکھ چکے تھے، ہاں وہ مہران شاہ کو خون میں نہایا ہوا اور اسے بھاگتے ہو دیکھ چکے تھے ارادتا نہ سہی خون تو ہو چکا تھا اس کی غلطی سے وہ بھی رئیس مہران شاہ کا بابا سائیں کے کڑیل جوان بیٹے کا۔

ہا، میرا دادا، میرا بھائی، مہران شاہ خدا تجھے میری عمر بھی لگا دے یہ یہ کیا ہو گیا ایسا

کیوں ہو گیا میں نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔

میں نے تو سجاوَل کے قتل سے اسے بس روکنا چاہا تھا۔ اپنے بچا کے قتل کا تو نہیں سوچا تھا۔

اجانک دروازہ باہر سے پٹا گیا۔ وہ اچھل کر پیچھے ہوئی پھر پھٹی پھٹی آنکھوں سے دروازے کو یوں دیکھنے لگی جیسے اس کے پیچھے بابا سائیں کھڑے ہوں سرخ آنکھوں کے ساتھ ہاتھ میں بندوق پکڑے۔

سائون دروازہ کھولو، سائون غضب ہو گیا۔ واز اللہ رکھی کی تھی، اس نے خشک حلق کو تر کیا۔ پھر چادر سے منہ پونچھ کر چٹخنی گرا دی۔ سائون غضب ہو گیا وہ رکیں مہراں شاہ ہے نا اے۔۔۔ اے گولی لگ گئی ہے۔ رکیں سلطان اے اسپتال لے کر گیا ہے۔ وہ چھوٹے ہی بولی۔

زیمیل۔ عابدہ کھلے دروازے سے بدحواس اندر داخل ہوئیں ان کا دوپٹہ ان کے پیروں میں تھا اور چہرہ نسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

زیبے ادا مہرنا اپنی بندوق صاف کر رہا تھا کہ گولی چل گئی۔ وہ سسکتی ساکت صامت زیمیل کی طرف بڑھیں۔

تجھے کچھ خبر ہے نیچے فٹ پچی ہے ہمارا سونہرا ادا چل بسا زیمیل۔ عابدہ گے بڑھ کر اس سے لپٹنے لگیں تو وہ لہرا کر ان کے بازوؤں میں جھول گئی۔

بچل اپنی چار پائی پر لیٹا کبھی چھت کو گھورنے لگتا کبھی اماں اور ابا کو جو گھر کا ساز و سامان باندھ رہے تھے بلقیس رسوائی کا سامان پہلے بکس میں بھر رہی تھی، ساتھ ہی رو بھی رہی تھی۔

بچل کی چار پائی کے پاس سے گزری تو زور سے سسک پڑی۔

میں تو دوں گی حویلی والوں کو منہ بھر بھر کر بددعائیں خدا ان پر قہر نازل کرے، جس طرح انہوں نے ہمارا ہنسا ہنسا گھر برباد کیا ہے خدا وڈیرے کا گھر بھی کرے۔  
بچل نے پیسی سے لب کاٹ کر منہ پھیر لیا۔

بلقیس اس کے پیسوں سے بندھے پیروں کے نزدیک بیٹھ گئی۔

خدا اس وڈیری زیمیل سے بھی حساب لے گا، جس نے تجھے ان حالوں کو پہنچایا ہے، اس کا کیا گیا وہ تو۔

بلقیس۔ بچل نے غصے سے اسے دیکھا۔

کیوں الناسیدھا بولے جارہی ہے۔

کیوں کیوں نہ بولوں ہمارا گھر برباد ہوا، ہم گوٹھ سے جارہے ہیں، تیرے پیر بلوں سے بھرے پڑے ہیں اور میں اس وڈیری کو ان حویلی والوں کو ان ظالموں کو کچھ نہ بولوں، برسوں تیری نمک حلائی کا یہ صلہ دیا ہے ان ظالموں نے۔

تو جانتی ہے اس میں زیمیل کا کوئی قصور نہیں۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہوگا، ارے چری تجھے کیا خبر ان اچی اچی دیواروں کے اندر بہت کچھ ہو جاتا ہے، وہ مظلوم نہ



ہوتی تو بھلا کیوں بھاگتی اور پھر یہ بتا اور پھر یہ بتا کہ اس نے حکم تو نہیں یا تھا نہ مجھے، التجا کی تھی تیری بھی تو یہی صلاح تھی بول کیا تو نے اور میں نے صرف ان کی خاطر یہ کیا تھا کہ اپنے سجاوے کے لیے۔

چل اماں اور ابا کی موجودگی کے احساس سے دبی زبان میں بات کر رہا تھا۔ بلقیس منہ پر چادر رکھ کر اپنی سسکیاں روک رہی تھی مگر آنکھیں تو اتر سے بہہ رہی تھیں۔  
مجھے کیا خبر تھی یہ سب ہو جا گا یہ وڈیرے کسی کو ذرا بھی رعایت دینے کو تیار نہیں ہوتے، جو تیرا جرم تھا ادا وہی بتاتے نا گوٹھ والوں کو، اور جرگے والوں کو تجھ پر چوری کا جھوٹا لازم رکھ دیا۔

اچھا، بس کرنا۔ چل نے اسے جھڑک دیا اماں اس طرف جلی گئیں۔  
چل اٹھ یہاں سے یہ پہلے ہی پریشان ہے تو اور بھی پریشان کر رہی ہے، وہی ہوا جو نصیب میں لکھا تھا ہم شہر جا کر اس کا علاج کرائیں گے سجاوے ہے نا میرا پٹ وہاں۔ اب گوٹھ میں رہنے کو میرا دل بھی نہیں کرتا تیرے ویاہ (ویاہ) کے لیے نہیں گے اب، بلقیس چار پائی سے اٹھ گئی۔

نہیں کرنا مجھے ویاہ، بس میرے ادا جائیں۔۔۔ کے پیر ٹھیک ہو جائیں اماں۔ وہ سسکیاں دباتی وہاں سیٹ گئی۔

چری ہو گئی ہے اماں یہ تو۔ چل زور سے ہنس پڑا۔ مگر اس کی یہ ہنسی مصنوعی اور کھوکھلی تھی کہ

جس کا خود بھی احساس کر کے وہ چپ ہو گیا پھر نکھیں موند لیں۔

اسے کوئی امید نہیں تھی کہ اس کے پیر اب ٹھیک ہوں گے۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو سکے گا۔ وہ جانتا تھا سجاوِل کے پاس اتنی پیسے کہاں سِائیں گے کہ وہ اس کا علاج کرے گا، بابا کی جِوز مین تھی وہ بھی جر گے والوں نے سزا کے طور پر رکھ لی تھی۔ وہ بڑے لوگ تھے سب کدِج کر سکتے تھے چاہتے تو اسے حویلی کے اندر ہی گزلی سے اڑا دیتے۔ مگر اسے شاید یہ اذیت دے کر وہ ایک طرح سے سجاوِل کو بھی خبردار کرنا چاہتے تھے۔ اس کے مقاصد اور اس کے ارادوں کے سامنے خوف کا مہیب جال پھیلا دینا چاہتے تھے۔

اب تو خود اس کے دل میں بھی وڈیرے حق نواز اور رئیس مہراں شاہ کے خلاف نفرت کا جذبا منڈرہا تھا۔ ان کی اجارہ داری ان کے مظالم پر چیخ چیخ کر بولنے کو دل چاہ رہا تھا۔ اچانک پیروں سے ٹیسس اٹھنے لگیں۔ اس نے کراہ کر نکھیں کھول دیں درد سے پورا بدن ٹوٹنے لگا۔ پیروں کی آٹھن پورے بدن میں پھیلنے لگی، نکھوں کے سامنے دھندلاہٹ کا غبار پھیل گیا۔ اس نے چہرہ موڑ کر دیکھا۔ بابا گھڑے اٹھا کر فقیر محمد کے بیٹے رئیس کی مدد سے یہ سب سوز و کی میں رکھوا رہے تھے۔

ادا۔ بلقیس اس کے پاس چلی ئی۔ اس نے پیر اپانی سے دھولیا تھا۔

تیرے سامنے زینل کے ساتھ کیا کیا تھا وڈے رئیس نے۔

تو کیوں پوچھ رہی ہے، تو تو اسے منہ بھر بھر کر بددعا نہیں دے رہی تھی۔ وہ چڑ کر بولا۔

نہیں ادا میں اس بیچاری کو کیا بد دعائیں دوں گی، وہ کون سی سکھی تھی، عورت چاہے غریب کی ہو یا امیر کی ایک سادل رکھتی ہے، ایک سے دکھ ہوتے ہیں۔ وہ تم مجھ سے بھی زیادہ پیسے اور بیاختیار تھی ادا۔

سچل نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر چھت کو گھورنے لگا۔  
میں وڈیری عابدہ کو دیکھتی ہوں، تو میرے اندر کچھ ٹوٹ جاتا ہے۔ پتا نہیں ان وڈیروں کے دل اتنے سخت کیوں ہیں ادا رحم ان کے اندر کیوں نہیں ہوتا عورت چاہے ان کے ہاری کی ہو یا ان کی اپنی، اسے بھڑبھری سے زیادہ نہیں سمجھتے۔

زیمیل اگر حویلی میں راضی خوشی ہوتی یہ حویلی کی دیواریں یہ دولت اس کے لیے خوشی کا باعث ہوتیں تو وہ بھلا اتنا بڑا قدم کیوں اٹھاتی ہاں ادا اتنا بڑا خطرہ بھلا کیوں مول لیتی۔ وہ تو خوشیوں کی تلاش میں ادا سجاوہ کی طرف بڑھی تھی مگر۔۔۔

بلقیس کی آواز بھرا گئی وہ ملول ہو رہی تھی۔ اسے رہ رہ کر زیمیل حق نواز کا خیال ستا رہا تھا اس سے جدائی کا رنج اس کی فکر کھا جا رہی تھی۔

اداوہ بڑی خوش تھی سجاوہ کا یہ اسکول دیکھ کر اس نے اپنے نگن بھی اس اسکول کے خرچے کے لیے دے دیے تھے۔

سچل نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

اچھا۔



افسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے  
فریبِ زیست سے قدرت کا مدعا معلوم  
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے



شام کو اس نے بھاگل کے ہاتھ سے کرتا لیتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔  
بلقیس نئی اور ایسے ہی چلی گئی تو نے روکا نہیں اسے۔ اس نے جھک کر سیڑھیوں کی  
طرف دیکھا۔

نہ سائیرن، بلقیس خود تو نہیں نئی وہ نیچے تو۔۔۔۔۔

ارے تو کیا ماسی سیکہ خود نئی ہیں۔ کمال کرتی ہو تم، روکنا نہیں۔ ٹھہرو میں دیکھتی ہوں  
ابھی گئی نہیں ہوں گی۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے بھاگی۔

وہ تو نہیں نئی زیمل بی بی۔ بھاگل نے سیڑھیاں اتر کر اسے پکارا مگر وہ ساری سیڑھیاں  
پھلانگ کر اس کی نظروں سے انجھل ہو چکی تھی۔ پوری لابی خالی تھی۔ وہ باہر کی جانب بھاگی مگر  
پھر شہ گئی۔ اس کے ہاتھوں میں بلقیس کا بھیجا ہوا جگمگ کرتا،

مگر تالرز کر رہ گیا۔ وہ پلٹ کر جا رہا تھا۔ چوڑیوں کی چھن چھن، ویزوں کے چھوٹے

ہاں ادا، وہ سجاوِل کی باتیں اس کے نظریات سن کر بڑی خوش ہوئی تھی اس کا بھی خواب تھا کہ گوٹھ کا ہر بچہ تعلیم حاصل کرے پر۔ اس نیا بری سانس لے کر گھر کے اس حصے کی طرف نگاہ ڈالی جہاں سجاوِل نے ساوکل کھول رکھا تھا اور کچھ عرصہ قبل چھوٹے جھوٹے بچے بستہ اٹھا تھے الف سے اللہ کی پہچان کرائی جاتی تھی۔

سجاوِل کہتا تھا الف سے پڑھنا سیکھ گئے تو اہل کو سمجھنے لگو گے۔۔۔ اس کی طاقت کو پہچاننے لگو گے، ان جھوٹے معبودوں اور جاگیرداروں کے بتوں کو سجدہ کرنا ان کے گے ہاتھ باندھنا چھوڑ دو گے۔

کتنی میٹھی باتیں کرتا تھا سجاوِل کتنے اونچے درجے تھے اس کے۔ وہ اس حصے میں کھڑی ہوئی۔ اور جلی ہوئی دیواروں کو تھکنے لگی جنہیں وڈیروں کے کارندے رات کو کرگ لگا گئے تھے اب وہاں خالی دیواریں تھیں۔

کتابین، چٹائیاں ان معصوم بچوں کے خواب سمیت سب جل کر اکھ بن چکے تھے۔ مجھے پورونا اس بات پر تا ہے ادا کہ تیری اتنی بڑی قربانی کے بعد بھی سجاوِل اور زیمل ایک نہ ہو پتا نہیں ادا سجاوِل کیسے بھول پاگا، اور وہ، وہ تو دیوانی تھی ادا سجاوِل کی، اسے دیکھ کر ہوش بھلا دیتی تھی۔ اس نے دل سے چاہا تھا سجاوِل کو۔

ہاں دکھ تو یہی ہے کہ اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی کچھ حاصل نہ ہو سکا۔ سچل کے لہجے میں تاسف اور شکستگی کا دھواں تھا۔

بلقیس کھڑکی کے باہر پھیلے سکوت اور بڑھتی ہوئی تاریکی کو گھورنے لگی پھر چونک کر پلٹی، چادر سے نم اود نکھیں صاف کر کے اماں کی طرف چلی ئی اور ان کے ساتھ بکھری چیزیں سمیٹنے لگی۔ ڈھلتی رات کی دبیز تاریکی میں ہی امداد علی کا پورا گھر گوٹھ چھوڑ کر شہر کی جانب اپنا سفر شروع کر چکا تھا۔ بلقیس چادر میں منہ جھپانم نگاہوں سے اپنے گوٹھ کو دیکھ رہی تھی۔ حویلی کے سامنے سے گزرتے ہو اس کی سسکاری نکل گئی۔ تلخ د شیریں بہت سی یادیں وہ اپنے دامن میں سمیٹ کر جا رہی تھی۔

حویلی کا وہ کنب، وہ زمیل و ڈیری کی شرارتیں اور مسکراہٹیں اب یاد بن کر رہ جاتیں گی۔ پچل کا ہاتھ اس کے شانے پر یا تو اس نے رخ موڑ کر اسے دیکھا تب افسردہ مسکراہٹ سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی نم نم نکھوں کے ساتھ مسکرا دی۔

مہران شاہ کی جوان موت نے حویلی میں سناٹے طاری کر دیے تھے سوئم کے بعد وڈیرہ حق نواز نے پہلی بار اپنے کمرے اور اوطاق سے نکل کر حویلی کا چکر لگایا۔ راہداری میں بلا مقصد ادھر سے ادھر ٹہلتے رہے اور پھر لابی میں بیٹھ کر حقہ گز گزایا۔

کمد ار۔

جی سوہنا سائیں۔ کمد ار سرعت سے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

بابا اب ہم کسی بھی ملاقاتی سے نہیں ملیں گے۔

بہوت (بہت) بہتر سائیں، میں ابھی پرل کو پچانک پر منع کیے دیتا ہوں۔ کمد ار حکم کی



تعمیل کے لیے باہر نکل گیا۔

بابا سائیں، پ نے مجھے بلوایا تھا۔ سلطان شاہ اپنے کرتے کی ستین کے بٹن بند کرتا ہوا لابی میں یا جہاں وڈیرہ حق نواز حقہ کی گڑ گڑاہٹ کے ساتھ کسی سوچ میں گم تھے نظر اٹھا کر سلطان شاہ کی طرف دیکھا اور مسلسل دیکھتے رہے۔

چھ فٹ سے زیادہ لمبا قد جوڑے شانے، چہرے پر ہلکی داڑھی مونچھ وہ بیس سال میں کڑیل اور بھرپور جوان ہو چکا تھا ایک پل کون کی نکلیں غبار لود ہو گئیں۔ حقے کے کنارے پران کی انگلیاں مضبوطی سے جم گئیں۔ ایسے ہی ایک کڑیل بیٹے کو وہ کھوچکے تھے ان کی نکلیوں کا نوران کا مضبوط بازو وقت کی بیرحم دھول نے کاٹ کر رکھ دیا تھا۔

اب ان کی تمام ترامیدوں کا مرکز سلطان شاہ ہی ہو سکتا تھا۔

وہ کھڑے ہو گئے اور دونوں ہاتھ پشت پر باندھ کر اس کی طرف بڑھے۔

ہاں میں نے بلایا تھا تمہیں۔ انہوں نے سرخ سرخ نکلیں اس کے چہرے پر

جمادیں۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا ایسا کڑیل گھروپٹ ایک چھوٹی سی گولی کا شکار بن

جا گا، دیکھو ذرا یہ حیولی کیسی ویران ہو کر رہ گئی ہے۔ تم نے مہران کا کمرہ دیکھا ہے کتنا سونا اور

ویران ہو گیا ہے۔ میرا سینہ کھنڈر ہو گیا اس غم میں سلطان۔

سلطان نے رنج سے باپ کو دیکھا پھر ایک ملول اور اداس سانس بھر کر رہ گیا۔

میرے اندر گ بھڑک رہی ہے، بیٹے کے کھوجانے کا غم کھا رہا ہے میرے سینے کو، وہ میرا شہزادہ تھا، اچھی ان بان والا۔ میرے منہ سے نکلنے سے پہلے میرے جملوں کا مفہوم سمجھ لیا کرتا تھا۔ گوٹھ والوں پر اسکی دہشت تھی شہروں کی میٹنگوں میں وہ کیسا اونچا بولتا تھا کہ سب کو چپ لگ جاتی تھی۔ ہاری اس کے پیروں کی دھمک سے سہم جاتے تھے، حویلی اس کی بھاری واز کی ہنسی سے گونج اٹھتی تھی، ملازم کانپتے تھے اس سے۔

بابا سائیں۔ سلطان شاہ نے نرمی سے ان کی بات کاٹتے ہو کہا۔

ہم چاہیں جتنے بھی اچے ہو جائیں، مگر رہیں گے انسان، سامان کو نہیں جھو سکتے، ہمارے پیروں کی دھمک سے جتنی بھی گونج پیدا ہو، ہم رہیں گے فانی انسان بلا خراس مٹی کے اندر جائیں گے اس اوپر والے کے سامنے ہر انسان برابر ہے بابا سائیں، ہاری ہو یا بادشاہ سب کو مٹی کے ایک چھوٹے حصے میں دفن ہونا ہے۔

ہاری اور وڈیرے کو ایک صف میں کھڑے کرنے والے احمق چھوڑے مجھے تم سے یہی امید تھی تم میں اور مہران میں یہی تو فرق تھا بہر حال میں نے تمہیں امیری اور غربی پر لیکچر دینے کے لئے نہیں بلایا۔ میری طرف دیکھو ایک بات کی طرف جو اونچپٹے کی المناک موت پر نوحہ کناں ہے تو دوسری طرف اپنی عزت کی بکھرتی دھجیاں تنہا سمیٹتا پھر رہا ہے۔

جی، میں سمجھا نہیں بابا سائیں۔ سلطان شاہ نے استفہامیہ نظروں سے باپ کی شکل دیکھی جہاں غصہ دکھائی دے رہا تھا۔

تم نے مجھ سے غلط بیانی کی ہے سلطان۔ میرا مہراں شاہ اپنی راکفل صاف کرتے ہو نہیں مرا۔ اسے خود میری دھی، جسے میں دھی کہنا حرام سمجھتا ہوں زیمیل نے مارا ہے اس کی کمین سجاو کی خاطر، بولو میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ کمدار نے اپنی نکھوں سے وہ منظر دیکھا تھا۔ غلط دیکھا تھا۔ سلطان شاہ تڑپ کر چیخا، اس کا دل سینے کی دیوار میں زور و شور سے ٹکرانے لگا۔ ایک لمحے کو بابا سائیں کی سخت نظروں سے وہ بہم گیا مگر دوسرے پل وہ اعتماد سے تن کر کھڑا ہو گیا۔

غلط دیکھا ہے اس نے، بیشک وہ اپنی راکفل صاف نہیں کر رہا تھا مگر۔ وہ ذرا دیر چپ ہوا۔

تو تو پھر کیسے مرا وہ بتاؤ میں نے خود زیمیل کو میٹرھیوں کی طرف بھاگتے دیکھا تھا، مہراں شاہ کے پاس نے کے بجا وہ اسے خون میں لت پت دیکھ کر بھاگ رہی تھی مجھے تو اب ہوش یا ہے میں جانتا ہوں اس حرام خور نے میرے پٹ کی جان لی ہے، اسے۔۔۔

نہیں بابا سائیں، اس نے مہراں شاہ کی بندوق اٹھا کر خود کو مارنے کی کوشش کی تھی اس نے سن لیا تھا کہ ادا مہراں موبائل پر سجاو کی موت کا پروگرام ترتیب دے رہا تھا یہ سن کر وہ خود کو مارنے کی دھمکی دے رہی تھی کہ ادا نے اس کے ہاتھ سے بندوق چھیننا چاہی اور بس اس چھیننا جھپٹی میں گولی نکل گئی جو ادا کو لگ گئی میں سچ کہہ رہا ہوں بابا سائیں۔ اس نے ادا کو مارنے کی



قطعاً کوشش نہیں کی تھی۔

وڈیرہ حق نواز کا چہرہ لال ہو گیا ان کی آنکھوں میں سرخیاں اتر گئیں۔ پیشانی پر شکنوں کا جال پھیل گیا انہوں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے سامنے رکھی تپائی کو زور سے پیر کی ٹھوکر سے دوڑاڑھکا دیا۔

اس لڑکی کو مہران کی جگہ مرجانا چاہیے تھا، کیوں روکا مہران نے اسے، یہ رسوائی وار بدنامی کا داغ ہے ہماری پیشانیوں پر، میں نے پیدا ہوتے ہی اس کا گلا کیوں نہ گھونٹ دیا تھا، دھیان ایسی ہوتی ہیں، دیکھتے نہیں ہو عابدہ کو، کیسے لاج رکھی ہے اس نے ہماری، مگر یہ لڑکی۔۔۔ نفرت ہو گئی ہے مجھے اس کی صورت سے، میں اسے خود اپنے ہاتھوں سے ختم کر دوں گا۔ وہ غصے سے اپنی جگہ سے اٹھے سلطان گھبرا کر ان کے سامنے آیا۔

نہیں بابا سائیں میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا، پہلے ہی اس کی ذہنی حالت ابتر ہے وہ بلا قصور سزا سہہ رہی ہے۔

کیا تم اسے بے قصور کہہ رہے ہو۔ وڈیرہ حق نواز نے دہکتی نگاہوں سے سلطان شاہ کو گھورا اور اسے ایک طرف دھکیلنا چاہا مگر وہ چٹان کی طرح جھاربا بلکہ اس نے مضبوط بازوؤں سے باپ کے شانے تھام لیے۔

ادا کی موت یوں ہی لکھی ہوئی تھی وہ اگر آپ کا پٹ تھا تو ادی بھی آپ کی دھی ہے، کیا ہم نے پہلے ہی بیٹیوں کے ساتھ زیادتیاں نہیں کیں، جواب انہیں موت کے گھاٹ بھی

اتارنے لگیں۔ ان کی روحوں کو کب زندہ رکھا ہوا ہے ہم نے۔

بکو اس بند کرو۔ وڈیرہ کی سانسوں میں بھونچال گیا۔ چہرے کے زاویے بگڑ گئے۔

اگر یہ لڑکی زندہ رہی، تو اور بھی رسوائیاں ہمارے مقدر میں لکھتی رہے گی، وہ ایک باغی ہے اسے ہماری عزتوں کی پروا نہیں رہی۔

گستاخی معاف بابا سائیں اسے باغی اس استتصال نے بنایا ہے، ان ریت روایتوں نے جو کانٹوں اور نشتر کی طرح ہم ان کی روحوں میں اتارتے رہے ہیں اگر ادی عابدہ چپ ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ خوش ہے وہ راضی خوش حویلی میں دن کاٹ رہی ہے، ہرگز نہیں، بلکہ وہ ایک زندہ لاش ہے جس کے تمام احساسات، جذبات کا مار دیا گیا ہو۔ جس کی روح کو قتل کر دیا گیا ہو۔

بابا سائیں حویلی کی کوئی عورت خوش نہیں ہے، بلکہ وہ تو خوشی کے اصل مفہوم سے بھی گاہ نہیں ہے، مرجانا ہسان ہے بابا سائیں مگر مر کر زندہ رہنا، زندہ رہ کر بار بار مرنا بہت اذیت ناک ہوتا ہے۔

پ، میں یا اس حویلی کے مرد کیا جانیں جنہیں اپنی روایتوں، اپنی دولت، اپنے اونچے شملے سے پیار ہے، کسی روایت کی پاسداری ادا مہر ان کے لیے کیوں نہیں تھی۔ میرے لیے کیوں نہیں ہے، کیا ہماری جھوٹی عزتوں کا بار صرف عورت کو ہی اٹھانا ہے۔ ایک کمزور نحیف عورت کو۔ کیا یہ ظلم نہیں ہے، جبر و استبداد جس زمین پر قدم رکھ چکا ہو وہاں سے گزرنے والی

ہوا نہیں بھی بوجھل مضحل ہوئی ہیں اس میں سانس لینے سے پھپھروں میں  
خوشبو روشنی نہیں اترتی بلکہ گھٹن محسوس ہوتی ہے اور حویلی میں عورتوں کے لیے ایسی ہی  
گھٹن ہے اور زینل اس گھٹن اس جس سے گھبرا کر بھاگ رہی تھی۔

بابا سائیں اسے حق حاصل تھا۔ زاد فضا میں سانس لینے کا ان روایتوں کی زنجیروں کو  
توڑنے کا۔

وہ سرخ چہرہ لیے اپنے پورے اعتماد کے ساتھ ج پہلی بار وہ سارے پردے چاک کر رہا  
تھا۔ اس درد دیواروں کی سیلن دکھا رہا تھا جس پر وڈیرہ حق نواز اور رئیس مہراں شاہ نے دہدے  
رعب اور اپنے خوف کا پردہ لگا رکھا تھا مگر وہ ایک بیخوف اور کڑیل مرد تھا اسے بیا اعتمادی اور گھٹن  
کی ہوا میں نہیں پالا گیا تھا وہ کیوں خوفزدہ ہوتا۔

اسکی واز کی گونج سے لابی کے درو دیوار بل رہے تھے۔ ہمیشہ کم خن نظر نے والا سلطان  
شاہ، حویلی کی اس ساری گندگی سے ج نقابیں اٹھا رہا تھا۔ جس کی بواب اس کی برداشت سے  
بابر ہو چکی تھی۔

وہ چپ ہو گیا، وڈیرہ حق نواز بھی چپ تھے۔ ان کے پاس شاید کوئی الفاظ نہیں تھے جس  
سے وہ اسے جھٹلا سکتے یا شاید اس لیے کہ ان کے تمام پہلو کمزور تھے۔ یا پھر جارحانہ رویہ اختیار  
کرنا یوں بھی ممکن نہ تھا کہ ان کی ساری امیدوں محبتوں کا مرکز اب صرف اور صرف سلطان شاہ  
ہی رہے گا تھا۔



وہ اپنا غصہ ضبط کرتے ہو کر سی پر ڈھے گئے اور اسکی پشت پر سر لگا کر نکھیں بند کر لیں۔  
اور پیشانی پر انگلیاں رگڑنے لگے۔

بابا سائیں، میں نے کچھ غلط نہیں کہا، پ کی شان میں گستاخی نہیں کی میں تو صرف۔ وہ  
جھک کر ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بولا تو انہوں نے اپنی سلگتی نکھیں کھول دیں۔  
تمہارے اندر بھی زہیل کی زبان بول رہی ہے۔

سلطان سیدھا ہو گیا۔ اس کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ بکھر کر منجمد ہو گئی۔  
اس کے منہ میں زبان ہی کب ہے بابا سائیں وہ تو اپنے استعصال پر بھی زبان بند رکھے  
ہوے۔ مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔

کیا کرو گے تم۔ وڈیرہ حق نواز نے شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔  
چلے جاؤ یہاں سے، دفع ہو جاؤ تم اور اس لڑکی کو جنم واصل کر دو، اسے مار کر کسی نہر میں  
پھینک دو۔

وہ میری بہن ہے بابا سائیں، کوئی بے کار شے نہیں، میں اس کا بھائی ہوں، اس کا  
سابان اس کا محافظ ہوں اس کی خوشیاں ڈھونڈ کر لا کر دینے والا۔ وہ سرخ چہرہ لیے بول رہا  
تھا۔

پ سمجھ لیں وہ مر گئی ہے پ کے لئے میں اسے اس حویلی سے دور چھوڑ دوں گا۔ وہ  
پلٹ کر لابی کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا۔

سلطان۔ حق نواز کی گرج سے درود یوار مل گئے مگر سلطان شاہ کے قدموں میں ذرا بھی  
جنبش نہ ہوئی۔ وہ رکاضرور مگر ڈر کر نہیں اتر ایا۔

میں کل ہی اکبر سے اس کا نکاح پڑھوا کر اسے والیت کی حوالی بھیج رہا ہوں۔ وڈیرہ حق  
نواز نے حکم سنایا۔

وہ ذرا سا پلٹا۔

کہ بہت دور ہے بابا سائیں۔ اس کا چہرہ تنا ہوا تھا پھر وہ رکا نہیں اور بڑے بڑے ڈگ  
بھرتا لابی سے نکل گیا۔

شباہت زرد پھولوں کی طرح سے

دکھتی گ پر منڈلا رہے ہیں

صلا عام بہ نظارگی ہے

پتنگے راستے دکھلا رہے ہیں

تشنگی، تشنگی بجھا ہے

اور پھر تشنگی محبت کی

غیر محدود ہوتی جاتی ہے

ادی عابدہ نے شاہ لطیف کے کلام سے نظریں ہٹائیں تو چونک پڑیں اور جلدی سے

کتاب بند کر کے ٹیبل پر رکھ دی۔

چھوٹے گھنگھر وڑوں کی واز پر رک کر پلٹا اور جیسے زمیل حق نواز کے سامنے کائنات کا قصہ قلم  
گیا۔ ساری وازیں دم توڑ گئیں۔ بس صرف دل کے دھڑکنے کی واز سنائی دیتی رہی۔ اس کا  
جوان کڑیل وجود اس کی نگاہوں کے سامنے تھا جس کی صرف جھلک دیکھ کر وہ بیٹھے بیٹھے  
جذبوں کے دریا میں بہنے لگی تھی۔ ج روبرو دیکھ کر دیکھتے رہ جانا بالکل لاشعوری فعل تھا۔  
وہ اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے ہی سچل سے مختلف نہ تھا بلکہ وہ تو ہر انداز، ہر طور سے اس سے  
مختلف تھا۔

باقیس خود نہیں تھی؟ اس نے جیسے بہت بھاری سماعتوں کا بوجھ اٹھاتے ہوئے ہتکی  
سے پوچھا۔ وہ دم ہوشی کے عالم سے نہ نکلتی تو شاید وہ بے پاؤں یوں ہی چلا جاتا۔  
نہیں۔ مختصر جواب میں کوئی عاجزی یا جی حضوری نہیں تھی۔ وہ ایسا ہی تھا، اڑیل، تند خو، کم  
میز اور متکبر۔ بقول سچل کے چار جماعتیں پڑھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے۔ شہر کے کالج میں  
پڑھ کر خود کو منسٹر سمجھنے لگا ہے۔

بڑا پیارا کرتا ہے، باقیس کو شکریہ کہہ دینا۔ اس نے صاف جھوٹ بول دیا، حالانکہ ابھی کرتا  
ہوں ہی تہہ کہا ہوا اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ تو بس ان لمحات کو طول دینا چاہتی تھی۔  
اسے میرا سلام کہنا۔ وہ جانے کے لئے رخ موڑ چکا تھا۔ اس واز پر لمحہ بھر کا اور بغیر پلٹے  
سر کو ذرا سی جنبش دے دی۔

وہ سچل نہیں تھا نہ ہی اس حویلی کا کوئی ملازم کہ ہاتھ باندھے اس کے سامنے کھڑا رہتا



کیا ہوا زیمیل، کیا ہوا اماں۔ وہ زیمیل کی طرف بڑھیں جو اپنے بستر سے اتر کر خوفزدہ نظروں سے چاروں طرف نکھیں گھمار رہی تھی، ساتھ ہی ساتھ وہ خود سمٹی جا رہی تھی۔ اس کے سیاہ بال پشت پر اور گے سینے پر بکھرے ہوئے کالی رات اور بھی سیاہ نظر رہی تھی۔

کیا ہوا بچہ زیمیل۔ اس نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

نیند نہیں رہی ہے کیا۔

ادی ادی وہ بابا سائیں مم مجھے مار ڈالیں گے ہاں ادی وہ مجھے گولی مار دیں گے۔ اس خوف سے پھیلی نکھیں عابدہ کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ اس کی وحشی ہر نی سی نکھوں میں خوف کا ایک جہاں تھا۔

ادی، میں سچ کہہ رہی ہوں، ادا مہراں کو میں نے قتل نہیں کیا وہ پوں پ۔۔۔

ہاں ہاں دھی ہمیں خبر ہے وہ اپنی غلطی سے مرا ہے، چل ادھر بیٹھ، بابا سائیں تجھے نہیں ماریں گے وہ بھلا تجھے کیوں مارنے لگے۔ تو بھی ان کی دھی ہے۔ وہ اسے تمام کر بیڈ پر لے گئیں۔ اور بٹھانے لگیں۔

بیٹھ زیمیل۔ اس نے اس کا بازو دبوج لیا۔ اس کے چہرے پر خوف پھیلا ہوا تھا ایک وحشت ٹپک رہی تھی۔

مجھے ڈر لگ رہا ہے ادی۔

چری ہے تو لے یہ گولی پی لے سکون جاگا، اور نیند بھی۔ ادی عابدہ نے دروازے سے گولی

نکال کر اس کی طرف بڑھائی اور گلاس میں پانی بھرنے لگیں۔

ادامہ ران کو گزرے (مرے) چار دن ہو گئے ہیں اور تو اک بار بھی نیچے نہیں آئی، اماں  
تذہبی ماں زینت کسی سے بھی نہیں ملے گی، چاچی بھی آئی تھیں پوچھ رہی تھیں تیرا۔ عابدہ اسے  
باتوں سے بہلانے لگیں۔

نیچے۔۔۔ ہاں نیچے تو میں نہیں گئی مگر، مگر ادی نیچے بابا ساتمیں ہیں مجھے ڈر لگتا ہے ان  
سے۔ اس نے پانی سے گولی اتار کر ایک گہرا سانس لیا۔ اسی دم دروازہ کھلا۔ وہ اچھل کر بید سے  
کھڑی ہو گئی۔ خوف اس کی رگ میں ابو بن کر دوڑنے لگا مگر نے والا سلطان شاہ تھا، جسے  
دیکھ کر وہ سنبھل گئی۔

خیر تو ہے نادا۔ عابدہ اسے اس وقت اپنے کمریمیں دیکھ کر حیران ہو گئیں۔

وہ خاموش رہا پھر چلتا ہوا ان دونوں سے ذرا فاصلے پر رک گیا اس کے چہرے پر غیر  
معمولی پن دکھائی دے رہا تھا اس کی ناک کے کنارے سرخ ہو رہے تھے اس کی نظریں زمیں  
کے متوحش چہرے پر تھیں۔ جہاں ویرانی اور خوف اس کی آنکھوں سے جھانک رہا تھا۔

خاموشی کا یہ مختصر وقفہ بہت بوجھل تھا پھر اس خاموشی کا سلطان شاہ نے ہی توڑا۔

ادی ویمل کو چادر اوڑھادو، اور چپل بھی ڈال دو پیروں میں، اور تم بھی چادر اوڑھ لو۔ وہ

یہ کہتے ہوئے کھڑکی کے پاس آیا اور یونہی پردہ اٹھا کر نیچے جھانکا۔ پھر پلٹا تو عابدہ حیرت سے  
گنگ کھڑی تھیں۔

میں کچھ کہہ رہا ہوں ادی، زیمیل کو چادر اوڑھا دو۔

مم۔۔۔ مگر۔۔۔ سلطان، کیوں، کیا۔ عابدہ کے دل میں اذیتوں، ہوسوسوں کے مہیب سا لرز نے لگے، زیمیل اپنی جگہ سن کھڑی تھی۔

میرے پاس کسی سوال کا جواب نہیں ہے ادی جو کہہ رہا ہوں وہ کرو بس۔ اب کے سلطان کے لہجے میں تیزی تھی اور سختی بھی، عابدہ نے مزید کچھ کہنے کی ہمت نہ پا کر الماری سے اپنی اور اسکی چادر نکال کر زیمیل کو اوڑھا دی اور ایک خود پر ڈال کر بیٹ کے نیچے سے زیمیل کو چپل نکالنے لگی۔

اب میرے پیچ چلی و۔ وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل کر سیڑیاں اترنے لگا۔ ادی عابدہ نے نرمی سے زیمیل کو تھاما تو اس کا پورا بدن لرز رہا تھا۔ اس نے پیس نظروں سے عابدہ کی طرف دیکھا مگر وہ نظریں چراگئیں۔

وہ خود نہیں جانتی تھیں کہ سلطان شاہ کس مقصد سے یہ سب کر رہا ہے۔ وہ ان دونوں کو اس ڈھلتی شام میں کہاں لے جانا چاہتا ہے، یہ بابا سائیں کا کوئی حکم تھا یا اس کا اپنا کوئی فعل۔ زیمیل اور وہ کسی رو بوٹ کی طرح اس کے پیچھے سیڑھیاں اترنے لگیں لابی سے گزرتے ہوا ان دونوں کے قدم رک گئے۔ خری کنارے پر وڈیرہ حق نواز سرخ چہرہ اور انگارہ نکھیں لیے کھڑے تھے۔

سلطان یاد رکھنا، زیمیل کے لیے ج کے بعد اس حویلی کے دروازے ہمیشہ کے لئے بند



ہوں گے۔ ان کی گونج دار وازا بھری۔

زیمیل نے چہرے سے چادر ہٹا کر ان کی طرف دیکھا پھر دوڑ کر ان کے قدموں میں جھک گئی۔

بابا سائیں میرا قصور کیا ہے، میں نے کیا جرم کیا ہے کیا کر رہے ہیں یہ پ لوگ میرے ساتھ۔ اس کی سسکیاں لابی میں گونجنے لگیں۔

سلطان شاہ اس طرف یا زیمیل کو پکڑ کر ایک طرف ہٹا دیا۔

یہ باتیں ہم بعد میں کریں گے بابا سائیں۔ اس کا لہجہ بیلوچ تھا وہ زیمیل کو تھامے تیزی سے لابی عبور کر گیا۔

وڈیرہ حق نواز اگر چاہتے تو اپنے دمیوں سے اس پل سلطان شاہ کو روک سکتے تھے۔ زیمیل کو گولی سیاڑا سکتے تھے۔

مگر۔

وہ ایسا نہیں کر پایا وہ خود کو اندر سے پیس محسوس کر رہے تھے۔ ان کا جوان کڑیل بیٹا ان کے ارادوں میں حائل تھا۔ وہ کوئی کمندار یا غریب کا بیٹا نہیں تھا کہ اس سے سختی کر لیتے وہ تو خود ان کا اپنا خون تھا۔ اگر وہ مکمل ہی باغی ہو جاتا تو وہ بالکل تہی داماں ہو جاتے۔ ایک بیٹے کو کھو دینے کے بعد وہ خود کو بچہ کمزور محسوس کرنے لگے تھے۔

سلطان شاہ وہیل کو جہاں لے کر جا رہا تھا وہ جانتے تھے مگر وہ بیٹی کی وجہ سے بیٹے کو کھونا

نہیں چاہتے تھے انہیں سلطان شاہ کی ضرورت تھی ہر حال میں۔

ادابتاؤ تو سہی کہ کدھر کو لے جا رہے ہو تم ہمیں۔

ادی عابدہ نے بحیرہ میں بیٹھتے ہو ایک اور کوشش کی۔ مگر سلطان شاہ کے لبوں پر خامشی کا قفل پڑا تھا۔

ان سب کے بیٹھتے ہی غلام احمد نے بحیرہ کے بڑھادی۔ شام کا سرمئی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ مگر اس سرمئی مدھم روشنی اور سرسراتی ہوا میں درختوں کے پتوں کی حرکت کو دیکھا جاسکتا تھا۔ بحیرہ گوٹھ کے اونچے نیچے رستوں پر ہچکولے کھاتی تیزی سے بھاگ رہی تھی کچھ دیر بعد چاچا ولایت نواز کی کوٹھی دکھائی دینے لگی تو زمیل کا سانس اٹکنے لگا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، اس نے سلطان شاہ کو دیکھا جو اگلی سیٹ پر سردمہری کیساتھ بیٹھا تھا وہ لب کاٹ کر رہ گئی۔

مگر دوسرے پل بحیرہ چاچا سائیں کی کوٹھی سے گے نکل گئی اس نے پیچھے مڑ کر پہلے کوٹھی کو پھرادی عابدہ کی طرف دیکھا۔

ادی عابدہ نے نرمی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔ مگر زمیل کا دل خوفزدہ پرندے کی طرح سینے کی چہار دیواری میں پھڑپھڑاتا رہا، اچانک ایک تیز سکاری اس کے لبوں سے آزاد ہو گئی۔

ادا سلطان اگر اگر مجھے مارنا ہی ہے تو حویلی میں ہی مار ڈالو، دیکھو مجھے جنگل میں نہ چھوڑ

دینا مجھے کسی تنہا گھر میں نہ ڈال نا۔ مم مجھے بہت ڈر لگتا ہے تہائی سے اندھیرے سے۔  
وہ خوفزدہ بچے کی طرح سسک رہی تھی عابدہ کا سینہ رنج سے شق ہو گیا سلطان شاہ نے  
رخ موڑا وہ عابدہ سے لپٹ کر رو رہی تھی۔

پاگل ہو گئی ہے زیمیل، تو بہن ہے میری، میں تجھے بھلا کیوں مار ڈالوں گا۔ اور اس کے  
لبوں پو پہلی بار، نرم مسکراہٹ ابھری۔ اس نے پیچھے ہو کر اس کے کندھے پر تسلی  
دینے کے انداز میں ہاتھ رکھا، بھائی تو بہن کا نچل ہوتے ہیں بھری دھوپ میں ان کا  
سائبان ان کی خوشیوں کے رکھوالے، اس کے سلگتے ں سوؤں سے سلطان شاہ کی داز بھرا  
گئی۔

میں نے بغاوت کی ہے حویلی میں موجود فرسودہ رسموں اور روایتوں سے جس میں  
کمزوروں کی روحوں کا قتل ہوتا ہے میں اس نظام سے نفرت کرتا ہوں جس میں اندھے مظالم  
ڈھا جائیں جہاں احتجاج کرنے والوں کو قبر میں سلا دیا جاتا ہے میں پچل کے لیے کچھ نہ کر سکا  
ادی عابدہ کے لیے کچھ نہ کر سکا۔

مگر اب۔

ہجیر و جیشکے سے رک گئی، سلطان شاہ نے چونک کر غلام احمد کو دیکھا۔  
سائیں، وہ رئیس محمد کو لینا ہے نا۔ غلام احمد نے یاد دلایا اور ہجیر و سے اترا۔ اور اندھیرے  
میں سامنے چلا گیا کچھ دیر بعد یا تو اس کے ساتھ فقیر محمد کا بیٹا رئیس تھا۔ وہ دونوں ہجیر و کے



اگلے حصے میں کمر بیٹھ گئے اور بجیر و پھر چل پڑی۔

زیمیل کی بھیگی آنکھوں میں حیرت ہی حیرت تھی ج سلطان شاہ کے منہ سے سننے والے الفاظ ان کے لیے بالکل نئے اور انوکھے تھے۔

رات دھیرے دھیرے قدم جمنا ہی تھی درخت بڑھتی ہوئی تیرگی میں چھپ چکی تھی۔

کھڑکی کے باہر پھیلا ہوا سکوت اور سناٹا ایک بار پھر ہیبت ناک محسوس ہونے لگا۔ عابدہ حق نواز نے پردے گرا دیے۔

وہ دونوں ابھی تک یہ پوچھنے کی ہمت نہ کر پا رہی تھیں کہ وہ یہ گاڑی کن راستوں پر لیے جا رہا ہے۔

پتا نہیں رات کا کون سا پہر تھا کتنے بج رہے تھے بس ہر طرف گھورا اندھیرا تھا۔ بجیر و جھٹکے سے رک گئی تو سلطان شاہ کے ہمراہ وہ دونوں بھی اتر گئیں۔

سامنے ایک گھر تھا جس کے دروازے کے باہر چھوٹا سا بلب روشن تھا ان دونوں کے بیچ حیرت ہوئی وہ شہر میں پہنچ چکے تھے۔

سلطان شاہ نے زیمیل کا بازو تھامنا تو وہ پوری جان سے کانپ اٹھی اس نے سلگتی نگاہوں سے سلطان شاہ کو دیکھا مگر وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اس کی ساری توجہ اس دروازے کی طرف تھی جسے رئیس محمد بجا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا۔

اور وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ گھر کے اندر کی روشنی میں زیمیل پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے چادر میں چھپا چہرہ حیرت سے کھل گیا۔

سجاول اس کی نگاہوں کیسا منے تھا، جو خود بھی گنگ تھا۔

میں جانتا ہوں سجاول تم میرا استقبال کسی خوشی سے نہیں کرو گے بلکہ مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہو رہے ہو گئے۔

سلطان شاہ نے ہاتھ گے کیا جو مصافحے کے لئے تھا۔ مگر سجاول نے اسے نظر انداز کر دیا۔

اسکی نظریں سلطان شاہ سے ہٹ کر پیچھے چار دوں میں لپٹی ہوئی ان دو عورتوں پر جا پڑیں۔ اور جیسے ہی زیمیل حق نواز کے چہرے سے چادر ہٹی تو وہ اپنی جگہ ششدر رہ گیا مگر دوسرے پل اس کے ہونٹ بھیج گئے۔ پیشانی کی رگیں ابھر گئیں اس نے نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔

میں یہاں۔۔۔، پ میں سے کسی کے بھی استقبال کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوں۔ اس نے گھوم کر ریمیں کو بجد کڑی نظروں سے گھورا۔ وہ جو ایک طرف کھڑا تھا۔

سجاول کی نظروں میں غصہ دیکھ کر سہم گیا۔

سلطان نے کوئی جواب نہیں دیا، اسی دم کمرے کا دروازہ کھلا۔

پٹ اتنی رات کون ہے خیر تو ہے۔ اماں کی واز ابھری ان کے ہمراہ بلیتس بھی تھی جو

سلطان شاہ اور اس کے ساتھ کھڑی زیمیل کو دیکھ کر حیرت سے ششدر تھی۔

مگر اس کی حیرت کو زیمیل نے گے بڑھ کر توڑ ڈالا۔

بلیقیس۔ وہ بیاختیار اس سے لپٹ گئی۔

ادی عابدہ نے گے بڑھ کر لرزتی ہوئی سجاو کی ماں کو تھاما۔

رئیس، ہم، ہم، ہم بے قصور ہیں میرا پٹ بے قصور ہے۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر سلطان شاہ ک

قدموں میں گرنے لگیں سلطان نے جلدی سے انہیں اوپر اٹھا دیا۔

نہ چاچی میں رئیس سلطان بن کر نہیں یا۔ یہاں، میں تو سجاو کی پاس ایک بہن کا

بھائی ایک ضرورت مند بن کر یا ہوں، ایک التجا لے کر۔ اس کا لہجہ رسوں کی طرح دہنگ نہیں

تھا بہت عام سا اور قدرے نرم تھا۔ اماں نے بھگی ہوئی پلکوں کو جھپک کر یقینی سے اپنے منجیف

بازو پر ہاتھ رکھے رئیس سلطان کو دیکھا۔

کیسی التجا کیسی ضرورت۔ ان کی واز میں لرزش تھی۔

میں زیمیل کو لے کر یا ہوں ماسی، ایک بھائی بن کر یا ہوں اور اس کا عقد سجاو سے

کرانا چاہتا ہوں۔ اس کی واز کچھ بھر کے بعد جھاسکوت میں کسی ہم کی طرح پھٹی۔

سجاو اپنے پیروں پر مضبوطی سے نہ جما کھڑا ہوتا تو یقیناً لڑکھڑا جاتا، اس نے پوری

نکھیں کھول کر رئیس سلطان کو یقینی کے ساتھ دیکھا۔ ادھر بلیقیس کے بازوؤں میں دھیرے

دھیرے سسکیاں بھرتی زیمیل پر سناٹا جما گیا تھا۔



کبھی اپنی جگہ ششدر تھے سوا سلطان کے۔

سجاول، حق، اور سچائی کا علم جس کسی کے بھی ہاتھ میں ہو میں اس ہاتھ کا ہمیشہ سے احترام کرتا رہا ہوں۔ تم یہ مت سمجھو کہ اس تاریک سیاہ رات میں محض تمہارے زیان اور نقصان کی تلافی کی خاطر یا ہوں، نہیں میں اتنا باظرف نہیں ہوں۔ تمہارا جو نقصان جل کی موت کی صورت میں ہوا ہے اس کا ازالہ ممکن نہیں ہے اور ہمارا بھی جو نقصان ہو چکا ہے اس کی تلافی بھی نہیں ہو سکتی۔

سلطان شاہ نے گم سم کھڑے سجاول کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور ایک نظر زمیں پر ڈالی جو ابھی تک ساکت تھی۔

جذبے اور انگلیں کھیل نہیں، ہاں سجاول ان میں دل خراج ہوتا ہے ان کے ٹوٹنے سے پورا انسان ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے گزرتا ہے سجاول تم زیے کی پہلی اور خری خواہش ہو۔ اس نے زندگی میں کبھی کچھ نہیں مانگا اور پہلی بار مانگنے کی خواہش میں بہت کچھ کھو کر اتنی نادم ہے کہ ہر روایت کی بھینٹ چڑھنے کو تیار ہے۔ مگر ریت رسموں پر صرف کمزوروں کو قربان کرنے کا میں ہمیشہ مخالف رہا ہوں اور ج کھلی بغاوت کی ہے بولو میرا ساتھ دے رہے ہو یا پیچھے ہٹ رہے ہو۔

اس کا چہرہ اور نکلیں سرح ہو رہی تھیں۔ ان میں گہری سنجیدگی بدستور تھی۔  
سجاول تو بس اپنے دل میں ہوتے شور کو سن رہا تھا۔ سلطان شاہ جب ہوا تو کمریمیں

جب تک وہ خود اسے جانے کا اشارہ نہ کرتی یا خود پلٹ کر وہاں سے نہ چلی جاتی۔ وہ اسے اپنی بہن کی سہیلی ہی سمجھ کر اس کی امانت دینے یا تھا اور دے کر اب جا رہا تھا۔  
وڈیری زیمیل حق نواز کو بھی اس کے رویے کا قلق نہ تھا۔ اسے کب جھکے ہوئے سر اور حویلی کے رئیسوں کے سامنے جڑتے اور لرزتے ہاتھ پسند تھے۔

وہ اسے جاتا دیکھ رہی تھی کہ اچانک مہران شاہ کی بحیرہ انداد داخل ہوتی دکھائی دی۔ پچانک کا گیٹ کھلا اور بحیرہ انداد نرکی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ سے پچل اور فرنٹ سیٹ سے رئیس مہران شاہ اترے۔ وہ بھی وہیں ٹھہر گیا جبکہ زیمیل، مہران شاہ کو دیکھ کر کسی وحشی بہرنی کی طرح چھلانگیں مارتی اندر بھاگ لی۔

عجیب پیاسی زمینیں ہو گئی تھیں نکھ کی۔ وہ اپنے کمرے میں ٹی اور درپچہ کھول کر نیچے دیکھنے لگی۔ مہران شاہ اب وہاں نہیں تھا البتہ پچل اور وہ دونوں نے سامنے کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ دونوں ایک ہی خون تھے مگر دونوں کا مزاج مختلف تھا۔ دونوں بھائی تھے مگر بالکل علیحدہ شخصیات کے مالک۔ ایک گھر کا ملازم تو دوسرا اس کے دل کا مالک بن گیا تھا۔

پچل اوطاق کی طرف بڑھ گیا۔ وہ جلدی سے پردہ پورا سر کا کر اسے پورچ سے نکلتے دیکھتی رہی کہ بالکل اچانک موڑ کاٹتے ہوئے وہ ٹھہر کر تھا اور سر اوپر اٹھا کر اسی جانب دیکھا۔

زیمیل حق نواز کے ہاتھ سے پردہ چھوٹ گیا۔ اس کا دل سینے کی دیوار سے زور سے

قبرستان جیسی خاموشی چھا گئی اس سکوت کو چند لمحوں بعد سلطان شاہ کی واز اور زیمیل کی سسکیوں نے توڑا۔

میرا خیال ہے کہ تم ایک مضبوط اعصاب کے مالک اور زبان پر جان دینے والے مرد ہو تم نے یقیناً زیمیل سے وفاؤں کے وعدے بھی کیے ہوں پیچھے ہٹ جانے کا خوف لے کر تم گئے تو نہیں ہو گے بولو سجاوِل۔

سجاوِل کا سر اثبات میں ہل گیا۔ اس نے سر کو جنبش دے کر اقرار کیا مگر اس کی نگاہیں کسی بھی تاثر سے خالی تھیں۔

اس کے اندر ولولے جگانے والے جذبے مرچکے تھے یا اس نے ان پر مضبوط خول چڑھا لیا تھا۔ اپنے احساسات کی لود ہم کر لی تھی۔

اس کی نگاہوں کے سامنے پھل تھا، اس کے زخم خوردہ پیر تھے ہاسپٹل کے بیڈ پر اس کی دم توڑتی سانسیں تھیں اس کا اتنا نقصان ہو چکا تھا کہ وہ اب اپنی کسی بشری کمزوری کی گرفت میں نہیں ناچا ہتا تھا۔ وہ اپنی محبت اور دلے تقاضوں کو ذرا بھی اہمیت دینے کو تیار نہیں تھا۔

اس کا سر ہلاتا تھا تو صرف اس لیے کہ سلطان شاہ اسے ایک کمزور مرد بیوفا اور بزدل تصور نہ کرے یا پھر پس پردہ سلطان کی بغاوت کا ساتھ دینا چاہتا تھا۔

سجاوِل کے اقرار کے ساتھ ہی سب کچھ بہت جلدی میں ہونے لگا۔ اور صرف دو گھنٹے کے بعد زیمیل حق نواز تین بولوں کا اقرار کر کے سجاوِل علی شاہ کی بن گئی۔



اسے کچھ ہوش نہیں تھا وہ تو کسی روبوٹ کی طرح سب کے اشاروں پر چل رہی تھی۔  
عابدہ خوف اور خوشی کی ملی جلی کیفیت میں تھیں۔ بار بار ان کی نظریں بھٹک کر سلطان پر  
جاتیں اور ایک فرحت انگیز طمانیت کے احساس کے ساتھ پلٹتیں سلطان شاہ ایک  
ٹھنڈے میٹھے چشمے اور بھرپور شجر کی مانند لگ رہا تھا۔

زیمل چادر میں منہ چھپا بیٹھی تھی جب تمام کاروائی کے بعد سلطان شاہ اس کے پاس آیا  
اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو وہ تمام ضبط کھو بیٹھی اور مسہری سے اتر کر اس کے سینے  
سے لگ گئی۔

ادامیں نے۔۔۔ میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا۔ یوں اس طرح جیسے۔ ان کی نگہوں میں  
سمندر ٹھہر گیا تھا۔ اس کا بدن لرز رہا عابدہ۔۔۔ خوشی کے نسوڑوں کے ہمراہ اسے تھپک رہی  
تھیں۔

میں جانتا ہوں ادی تم نے خواہشوں کی تکمیل کا یوں نہیں سوچا ہوگا ایسے حالات میں  
خوشیاں بھی رنج کی طرح لگتی ہیں پر خوشیاں تو بہر حال خوشیاں ہوتی ہیں۔ اس کا احساس رنج  
چھٹنے کے بعد ہوگا خدا تجھے بادر کھے خوش رکھے۔

پر اداسائیں بابا سائیں تجھے مار ڈالیں گے ادا اور مجھے۔  
اب مجھے مار کر کی کریں گے چری، ایک بیٹے کو تو کھو دیا انہوں نے۔ وہ اداسی سے مسکرایا  
پھر اس کا چہرہ اوپر کر کے اس کے نسیو اپنی پوروں پر چن لیے۔

تو فکر نہ کر، وقت ہستہ ہستہ خود ہی ساری الجھنیں سلجھا دے گا۔ بیشک ابھی حویلی کے دروازے تم پر بند ہیں مگر ایسا ہمیشہ نہیں ہوگا ادی، ہم اللہ سے اچھی امید تو رکھ سکتے ہیں نا، کچھ پانے کے لیے تھوڑا کھونا بھی پڑتا ہے۔

سجاول۔ اس نیپا سکھڑے سجاول کو دیکھا۔

تم ابھی گوٹھ نہ نا۔ ہمارے بھی ابھی زخم تازہ ہیں بابا کا بھی بہت ویاں ہو چکا ہے۔ کبھی کبھی شیر کی طرح گر جتا انسان بھی بہت کمزور ہو جاتا ہے اور کمزوروں پر حملہ کرنا کوئی بہادری تو نہ ہوگی۔

سجاول کی ستواں ناک کے کنارے سرخ ہو گئے۔

مجھے اتنا کم ظرف اور کمینہ مت سمجھو رئیس سلطان۔ ہاں اپنے نقصان پر تمہیں معاف ضرور کرتا ہوں مگر اسے بھلانے کا وعدہ نہیں کرتا۔ وہ یہ کہہ کر رکنا نہیں اور دوسرے کمرے میں چلا گیا سلطان شاہ نے جیب سے سرخ نوٹوں کی گڈی نکال کر زمیل کے ہاتھ پر رکھ دی۔

یہ ایک بھائی کی طرف سے شادی کا تحفہ ہے، خدا تجھے سادہ ماگن رکھے۔ یقین کرو میں بہت مطمئن ہوں۔ خود کو جہاں کا پھلکا محسوس کر رہا ہوں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے بوجھ سے جھکے شانے خالی ہو کر ہوا میں معلق ہوں۔

زمیل، سجاول پر مجھے فخر ہے اس نے مرد ہونے کا ثبوت دیا یہ زبان کا پاس رکھا ہے

اپنے قول کا پکا ہے یہ لڑکا زبانی تو نے یہ منزل خود پسند کی ہے اب ہمت و حوصلے کی دیواروں کو  
کبھی گرنے نہ دینا۔ ایسا نہ ہو کہ کبھی تجھے یا مجھے پچھتانا پڑے اس اقدام پر۔

سلطان اور عابدہ اسے تسلیاں دے کر رخصت ہو گئے۔ بلیقیس نے روتی زیمیل کو خود سے  
لپٹا لیا۔

مجھے ایسا لگ رہا ہے بلیقیس جیسے میرے ایک ہاتھ پر مہکتا گل رکھ دیا ہو اور دوسرے ہاتھ  
پر دکھتا ہوا انگارہ۔ اس نے سسکاری لے کر بلیقیس کو دیکھا۔

مجھے خبر ہوتی بلیقیس کے محبت کے رستے اتنے پر پیچ اتنے کٹھن ہوں گے تو میں کبھی محبت نہ  
کرتی تکمیل کی خواہش میں اتنا کچھ برباد ہو جاگا، میں نہیں جانتی تھی بلیقیس کہ مجھے کانٹوں سے  
بھر راستوں پر سفر کر کے اپنے ہمراہ اور بہت سوں کو بھی زخمی کرنا ہوگا، اگر خبر ہوتی تو قسم سے  
اپنے آپ کو اندر ہی مار لیتی۔ ادی عابدہ کی طرح بچس ہو جاتی۔ اپنے تمام جذبوں پر برف  
گرالیتی ایک زندہ لاش ہو کر رہ جاتی۔

میں مجرم ہوں تم سب کی، مجھے معاف کر دیں۔ ماسی، میں نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا۔ وہ  
ماسی زرینہ کے قدموں میں گرنے لگی تو انہوں نے جلدی سے اسے کھڑا کر دیا۔

نہ نہ دھی رانی تو تو ہمارے گھر میں خوشی بن کر اتری ہے، میں تو رییس سلطان کو  
دعائیں دیتی نہ تھکوں، اماں تو۔۔۔ تو میرے سجاوٹ کا نصیب ہے۔ ہماری بھجھی اندھیری  
زندگی میں چراغ بن کرئی ہے۔



اسے کسی ایسے ہی نمگسار کی ضرورت تھی۔ ان ہی ہستیوں کی۔

بلیقیس اسے اپنے ساتھ کمریمیں لے گئی اور بہت دیر تک اسے بہلاتی رہی پھر زبردستی منہ دھلوا یا اور تیار ہونے کو کہا مگر اس نے کسی بھی قسم کے سنگھار سے انکار کر دیا۔

میں سجاول کی زندگی میں زبردستی مسلط کی گئی ہوں۔ بلیقیس یہ سب کیسے کروں، اسے نے مجھے اماں دے دی ہے یہی بہت ہے۔ وہ زردگی سے مسہری پر پاؤں لٹکا بیٹھی رہی اور سامنے دیوار کو خالی خالی نظروں سے گھورنے لگی۔

کیسی بات کر رہی ہے زبیرے، تو تو ادا سجاول کی پہلی اور خری خواہش ہے اس کی محبت ہے۔

خواہش تھی مگر اب تو۔ اس نے کرب سے لب دانتوں میں دبالیے۔

سجاول کا سپاٹ بیٹاثر جبرہ نظروں میں گھوم گیا اس کا نکاح کے فوراً بعد اس کے پاس سے اٹھ کر چلے جانا۔ اسے ایک نظر اٹھا کر نہ دیکھا بہت کچھ اسے سمجھا گیا تھا۔

وہ اپنے اندر، اب کسی خوش فہمی کو کیسے پال سکتی تھی وقت اور حالات نے ان دونوں کو ایک

کر بھی دیا تو یوں کہ جذبوں اور امنگوں کے چراغ بجھ چکے تھے۔

بلیقیس اسے سجاول کے کمریمیں زبردستی چھوڑ گئی تھی وہ عجیب سے احساس جرم کے ساتھ خاموشی سے ایک طرف کھڑی رہی۔

سجاول کمرے کی جھوٹی بالکونی میں کھڑا باہر کے اندھیرے میں جنے کیا تلاش کر رہا تھا۔

اسے اندرتے اور پھر بلقیس کو باہر جا کر دروازہ بند کرتے دیکھ کر یونہی کھڑا رہا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبا تھا جس کا شعلہ اندھیرے میں چمکتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔  
ایسی ہی چمک زبیل حق نواز کی نگھوں میں سجاوٹ کو پلٹتے دیکھ کر دکھائی دی مگر دوسرے پل معدوم بھی ہو گئی۔

اس کا چہرہ سرخ مگر سپاٹ تھا جیسے اس کے سامنے زبیل نہیں کوئی بے کار شے پڑی ہو، چتا نہیں اس نے واقعی دل ہی مار لیا تھا خوشی پیدا کرنے والے جذبے ولولے، مرچکے تھے یا اسے خود پر کنٹرول رکھنے کا ہنر تا تھا یا وہ اس سخت خول میں سمٹا ہوا تھا۔ جسے توڑنے کا حوصلہ کم از کم کمزوری زبیل میں نہ تھا۔

زبیل حق نواز مجھ سے کسی قسم کی توقعات نہ رکھنا ہو سکتا ہے تمہیں مایوسی ہو۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور نظریں اس کے چہرے سے ہٹالیں۔  
میرے اندر بہت گہرا ہے۔ وہ سارے خواب ان میں جل چکے ہیں، میرے پاس تمہیں دینے کوئی ٹھنڈے جھونکے نہیں ہیں۔ اس کی داز خشک تھی۔

یونہی ایک موہوم سی امید نے سراٹھایا تھا سارے قریب دیکھ کر خواہش کا جوشعلہ بجڑ کا یا گیا تھا اس کی سرد باتوں نے یکدم ہی بھاڑ الا وہ ایک طرف رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

میں بھلا ٹھنڈے جھونکوں کی تمنا کر بھی کیسے سکتی ہوں۔ میں تو اس گھر کے ہر فرد کی مجرم ہوں۔ مجھے خون بہا میں یا ہوا سمجھ لو سجاوٹ۔ اس کی داز زندگی ہوئی تھی، بہت نسو پینے کی

کوشش میں چہرہ لال ہو رہا تھا۔

سجاول نے اس کی طرف دیکھا مگر جلدی سے نظروں کا رخ موڑ لیا۔

مجھے تو ادا چلنے نے اتنی مہلت بھی نہ دی کہ میں اس سے معافی مانگ لیتی، اس کے ایک ایک زخم کا حساب مجھ پر واجب الادا ہے۔ میں کیسے تم سے کوئی تمنا رکھ سکتی ہوں یہی بہت ہے کہ تم نے مجھے میری ہی نظروں سے گرانے سے بچا لیا، ادا سلطان کے سامنے، مجھے معتبر کر دیا۔ اس کا لہجہ شکست خوردہ اور بکھرا ہوا تھا۔

میں ایسا کر کے شاید، پس پردہ سلطان کے حوصلے کو بلند کرنا چاہتا ہوں اور وڈیرہ حق نواز کو کمزور، وہ بیٹے کی اس بغاوت پر یقیناً ٹوٹ چکا ہوگا، بہت قرض نکلتے ہیں ذیل تمہارے اس ظام، سفاک باپ پر، بہت قرض۔۔۔ اس نے غصے میں مٹھیاں بھیجنے لیں چہرہ گ کے دل سے شعلے اٹھتے محسوس ہو۔

تم ن میرے پیروں میں ایک زنجیر ڈالی دی ہے ذیل کہ میں۔ وہ چلتا ہوا اس کے قریب یا۔ وہ اپنی جگہ سے کھڑی ہو کر اس کے مقابل چلی گئی۔

نہیں سجاول میں تمہیں نہیں روکوں گی، تم بابا سائیں سے ہر انعام لے سکتے ہو۔

سجاول نے جلتی نظروں سے اسے دیکھا پھر اس کے دونوں شانوں پر اپنی دونوں ہتھیلیاں جمادیں۔

کیا انتقام لوں، ایک انتقام تو قدرت سے مہرنا شاہ کی موت پر لے ہی لیا دوسرا سلطان



شاہ کی بغاوت نے اسے کمزور کر دیا ہے۔ اور اب میں کمزور سے انتقام لے کر کیا کروں گا۔ اس کے پاس فخر کرنے کا اب رہا ہی کیا ہے۔ اور تم نے یہ بات کیوں کہی کہ خون بہا میں کی ہو۔ اس نے سخت فہمائشی نظریں اس کے چہرے پر ڈالیں تو سا کیلبوں پر ایک مجروح مسکراہٹ بکھر گئی۔

اس نے اپنی نرم نم پلکیں اوپر اٹھائیں جس میں درد کی پرچھائیں لرز رہی تھیں کتنا قریب تھا وہ چہرہ جیسے پانے کی تمنا دل میں پھول کھلا دیا کرتی تھی کتنا پیاسا، مگر خود کو سیراب نہیں کر سکتا تھا۔

سامنے دریا رواں تھا مگر ہاتھ بڑھا کر ایک گھونٹ نہیں بھر سکتا تھا۔ دونوں کی نظریں ملیں تو کتنی دیر وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے مگر عالم مدہوشی کا یہ وقفہ بہت مختصر تھا سجاوٹ نے اچانک اسے دور دھکیل دیا۔ اس کی دونوں ہتھیلیاں یوں جلتی محسوس ہونے لگیں جسے انگاروں نے چدو لیا ہو اس کے اندر گ بھڑکی اٹھی نکھوں کے سامنے ہزاروں دکھ تازہ ہو گئے رگوں میں بھی دکھ گردش کرنے لگا۔

اس نے بہت جلد اپنی بشری کمزوری پر قابو پالیا۔ پھر رکا نہیں اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ زبیر حق نواز نے اپنے دل سے اٹھنے والی درد کی لہروں کو برداشت کرتے ہو اودھ کھلے دروازے کو دیکھ -

کیسے نہ سمجھوں کہ خون بہا میں کی ہوں ان ہی کے ساتھ تو ایسا سلوک کیا جاتا ہے۔

وہ وہیں کرسی پر ڈھسے گی۔

بے دم ہو بیمار دوا کیوں نہیں دیتے

تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

درد شب بھراں کی جزا کیوں نہیں دیتے

خون دل وحشی کا صلہ کیوں نہیں دیتے

بربادی دل جبر نہیں فیض نہیں کسی کا

وہ دشمن جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

دن بڑا بوجھل تھا۔ سجاول ناشتا کر کے بہت سویرے نکل گیا تھا، وہ ایک طرف بیٹھی منتظر

ہی رہی کہ وہ اسے خطاب کرے اس کی طرف دیکھے مگر وہ تو ایسا پتھر ہو چکا تھا۔ کہ

کاموں میں ہاتھ بٹاتی رہی بار بار ماسی اسے ٹوکتیں۔ بلقیس اس کے ہاتھ سے کبھی

برتن لیتی کبھی کپڑا چھین لیتی۔

پہلے دن کی دلہن بھلا کسی کام کو ہاتھ لگاتی ہے۔ ماسی زرینہ اسے پیار سے سرزنش کرنے

لگتیں۔ اس کے لبوں کی تراش میں مضحل سی مسکراہٹ بکھر گئی۔

دلہن تو بڑے ارمانوں سے لائی جاتی ہے۔ ڈھون پٹاخوں، باراتیوں کیساتھ میں ایسی

قسمت والی دلہن کب تھی۔ جو یہ تکلیفات کروں۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا جہاں سجاول

کے نام کا ایک پھول نہ تھا۔

حالات نے اس کی خواہش اور تمنا پوری کی بھی تو یوں کہ وہ تمناؤں کے پالنے کی خوشی بھی نہیں مناسکتی تھی کھل کر ہنسنا چاہتی تو نسوٹکتے تھے۔

اداسجاول کچھ اچھا نہیں کر رہا تیرے ساتھ۔ بلقیس اس کے نزدیک موڑھے کے پاس بیٹھ کر بہت پر ملا لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

میں اسے کہوں گی بھلا تمہارا کیا قصور ہے۔

قصور میرا نہیں تو اس کا بھی کت ہے، محبتیں چھین کر یا زبردستی حاصل نہیں کی جاسکتیں۔

اس سے زیادہ برا کیا ہو سکتا ہے کہ احساس دلا کر فحشی دکھا کر دو محبت بھرے بول حاصل کیے جائیں۔ چری فخر تو جھولی پھیلا بغیر مل جانے میں ہوتا ہے۔ پھیلائی ہوئی جھولی بھر بھی جاتا تو روح کو وہ شانتی نہیں ملتی۔ وہ فخر اور خوشی نہیں ملتی۔

اس نے پھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بلقیس کو دیکھا۔ بلقیس کا دل دکھ کی گہرائیوں میں ڈوب گیا،

مگر یہ تو ظلم ہوا نا تمہارے ساتھ۔

نہیں میں تو ایسا نہیں سمجھتی، میں بہت خوش ہوں بلقیس۔

سچ ادی میں بہت خوش ہوں۔ اس نے بلقیس کی گود میں رکھے اس کے ہاتھ پر اپنا ٹھنڈا

ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا۔

بلقیس اس کی نرم نرم پلکوں اور پھکی مسکراہٹ کو دیکھتی رہ گئی۔



نکرایا۔ چہرہ یوں لال ہو گیا جیسے سجاوِل سومرونے اسے چھولیا ہو۔ دوبارہ پردہ اٹھا کر دیکھنے کی ہمت نہ ہو سکی۔ وہ چلتی ہوئی بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے محسوس کیا اس کا دل انجانی راہوں پر چلنے لگا ہے، اس کی ہستی غیر محسوس طریقے سے ایک انقلاب سے دو چار ہو گئی ہے۔

اسے کہو بہت نامراد شے ہے جنوں  
اسے کہو کہ مجھے ہے بہت جنوں اس کا



میں سچ کہہ رہا ہوں مجھے تو یہ وڈیری زیمِل تھوڑی تھوڑی پاگل لگتی ہے۔ اس نے مسکراہٹ دبا کر پھر کہا۔ بلقیس نے خفگی بھرے انداز میں احتجاجاً اس کے گے روٹیوں کی تھالی پٹننے والے انداز میں رکھ دی۔

ایسی کونسی پاگلوں والی حرکت کی ہے اس نے؟ وہ اس کے سامنے چوکی پر منہ پھلا کر بیٹھ گئی۔ پاگل لوگ ایسے ہوتے ہیں کیا؟

ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔ وہ سر جھکا کر مسکراتے ہوئے روٹی توڑنے لگا۔ چشم تصور میں اس کا بے خود سا انداز لہرانے لگا۔

مجھے تو تم لگتے ہو پاگل، وہ تو بہت اچھی ہے۔ اس کے لہجے میں زیمِل کے لئے پیار ہی

اس روز سجاوُل یا اور جیب سے ایک تہہ شدہ پر چا نکالا۔

فقیر محمد کا پٹ رر کیس یا تھا وہ یہ خط دے گیا ہے حویلی سے یا ہے تمہارے لیے۔

اس نے وہ خط اس کی گود میں ڈال دیا اور خود باتھ روم میں چلا گیا۔ حویلی کے نام سے ہی اس کا چہرہ کھل اٹھا اور اس نے جلدی سے تہہ کیا ہوا پرچہ کھولا ادی عابدہ نے بہت پیار لکھا تھا اے۔

سختی زبیل۔

امید ہے تو خوش ہوگی حویلی میں بہت خیر ہے۔ تم فکر ہرگز نہ کرنا بابا سائیں بالکل چپ چاپ ہیں، ادا سلطان سے بھی کوئی جھگڑا نہیں ہوا ہاں البتہ چا چا ولایت نے بہت طوفان کھڑا کیا۔ خراتنی جاکد ادا تھا سے نکل جانے پر دکھ تو ہوگا۔ پر بابا سائیں نے انہیں کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ یہ بتا سجاوُل کیسا ہے اس کی محبت کے پھولوں سے دامن بھر کر تو، تو بہت نکھر گئی ہوگی۔ خدا تمہارے دامن کو ہمیشہ مسرتوں سے بھر رکھے، میں یہ خط جلدی میں لکھ رہی ہوں۔ بڑی مشکل سے بھاگل کور کیس کے ہاتھوں بھجوا رہی ہوں۔

باقی یہاں سب خیر ہے۔ اماں دعا دے رہی ہیں، زبیل۔ کچھ کھو کر کچھ پایا جاتا ہے۔ پر میں کہتی ہوں تو نے جو کھویا ہے اس سے زیادہ پایا ہے۔ اچھا میری طرف سے بلقیس اور ماسی زریہ کو سلام

شال سداائیں خوش رہیں

فقط دعا گو

ادی عابدہ حق نواز۔

وہ خط ہاتھوں میں لیے گم سم بیٹھی رہی۔ پھر خط لبوں سے لگایا۔

خبر نہیں ادی جو ہکویا وہ اچھا ہے یا جو پایا ہے وہ۔۔۔ میرے ہاتھ اور، میرا دامن تو خالی کا

خالی ہے۔

کس کا خط ہے۔ وہ تو لیے سے منہ پونچھتا باہر یا۔ اس نخط لبوں سے ہٹالیا اور تہہ کرنے

لگی۔

ادی عابدہ کا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور خط ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔

کیا لکھا ہے۔ اس نے تولیہ بیڈ پو پھینکا اور عدم دلچسپی سے پوچھا۔

کیا لکھتا ہے، دعا دے رہی تھیں سدا خوش رہنے کی۔ اس نے یہ کہتے ہو سجاوے کی طرف

دیکھا جو اپنے کرتے کی ستینیں موڑتا ہوا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نظریں ملنے پر رخ موڑ لیا۔

خوشیاں بہت مہنگی ہو گئی ہیں زینل حق نواز یہ خوشیاں بھی تھلیاں ہیں ان کے پیچھے جتنا

بھاگو یہ اتنی دور بھاگتی ہیں۔ جھپٹ لو تو ٹوٹ کر بکھر جاتی ہیں۔ اس کی نگہوں میں موجود

سنجیدگی میں اداسی کا دھواں بھی پھیل گیا۔

چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو تو سمیٹ کر دامن بھرا جاسکتا ہے نا۔ وہ ہنسی سے بولی۔

اگر ہوں تو نا۔ وہ ہنس پڑا، بڑی اداس اور ٹوٹے ہوئے شخص کی سی ہنسی تھی۔



انہیں ڈھونڈا جاتا ہے سجاد علی شاہ۔

سجاد جھٹکے سے اس کی طرف ڈگوما اس کی نظریں نیچی تھیں وہ اپنے لب دانتوں میں دبا  
نسو پینے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ چلتا ہوا اس کے مقابل یا۔

مانوس اور دل کے بے کل کر دینے اولیٰ خوشہوز یمل حق نواز کے س پاس پھیل گئی۔  
ڈھونڈا انہیں جاتا ہے جم گم ہو گئی ہوں، جو ختم ہو گئی ہوں جو بجھ چکی ہوں انہیں ڈھونڈا  
نہیں جاسکتا۔ اس نے زیمیل کی لرزتی پلکوں پر نظریں جمادیں۔ اسی پل زیمیل نے خمدار پلکوں  
کی باڑھ اوپر اٹھائی اور سجاد کو اپنا دل سینے کے مضبوط حصار سے نکلتا ہوا محسوس ہوا۔ سکی  
خواہیدہ نکھوں میں کیا کچھ نہ تھا۔ پلکوں کی نوک پر جھلملاتے قطرے بڑی بوجھل اور پگھلا  
دینے والی داستان سنار ہے تھے۔ یہ نکھیں، خمدار پلکیں اس سے ذرا سے فاصلے پر ہی تو تھیں  
یہ قطرے جنہیں وہ ہاتھ بڑھا کر اپنی پوروں میں چن سکتا تھا۔

مگر چن کیوں نہیں رہا تھا اس کی انا نے قدم روک رکھے تھے یا خود کو سیراب کرنے کی  
خواہش ہی مرچکی تھی، یا اتنے دکھوں نے اس کے اندر کے موسموں کو سلا دیا تھا۔

وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا وہ اپنے ہی شوریدہ سر جذبوں کی تندہی سے خوفزدہ ہو گیا جو ساحل دل  
پر سر پٹختے لگے تھے۔

میں نے کہا نامت توقعات باندھو مت خوشیوں کی منتظر رہو سب کچھ جل چکا ہے اس  
گ میں جو تمہارے باپ اور بھائی نے لگائی تھی۔ اب صرف راکھ کا ڈھیر ہے اور اس راکھ

کے اندر چنگاریاں ہیں جل جاؤ گی اگر کریدنے کی کوشش کرو گی تو۔ اس نے بڑی ہیرچی سے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ اور گے بڑھ کر پتائی پر زور سے لات ماری۔  
اس کا دل چاہ رہا تھا ہر چہ وہ ہنس نہس کر دے۔ زمیل حق نواز تپے ہو چہرے کے ہمراہ اس کے سامنے گئی۔

میں کریدوں گی اس راکھ کو، کون ہوتے ہو تم مجھے روکنے والے میں اس راکھ میں اس شعلے کو بلند کرنا چاہتی ہوں جو جلات انہیں ہے بلکہ روشنی بکھیرتا ہے۔  
زمیل۔ اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا مگر پھر دوبارہ پہلو میں گر گیا۔  
ناؤ گیٹ ڈٹ مت ش میرے سامنے ورنہ۔ میں کچھ کر بیٹھوں گا۔ تمہیں دیکھتا ہوں تو۔۔۔ تو قتل کر دینے کو جی چاہتا ہے۔ میری باپ تمہاری نظروں میں جاتا ہے۔ تو ارن ڈالو سجاو علی شاہ۔ ایک بار ہی مار ڈالو یہ بار بار کی شکستگی کی مت سے ایک بار مر جانا ہی اچھا ہے۔  
بکو اس مت کرو۔ وہ دھاڑا۔

مجھے کسی سے کوئی انتقام نہیں لینا فار گاڈ سیک، میری زندگی میں اتنی الجھنیں مت پیدا کرو۔ میرا سکون پہلے ہی غارت ہو چکا ہے اس میں مزید پتھر مت پھینکو۔  
اور میرا سکون۔ اس نے گھائل نظریں اس پر ڈالیں تو وہ شدت ضبط سے رخ موڑ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

میں تم سے کوئی نظر کرم کی بھیک نہیں مانگتی، میں تو وہ بھی نہیں مانگتی جو میرا جائز حق

ہے۔

اس کے اٹھتے قدم رک گئے وہ ایڑیوں کے بل پلٹا۔

ہاں، میرا جائز حق سجاوِل شاہ تم نے مجھ سے نکاح کیا ہے مجھے باہوش و حواس قبول کیا ہے، اتنے لوگوں اور گواہوں میں مجھے اپنایا ہے میں بھاگ کر نہیں ئی تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں دیا نہ پستول کی نال پر نکاح ہوا ہے ہمارا، پھر یہ انتقام تم کس سے اور کیوں لے رہے ہو۔

ہاں ہاں میں نے نکاح کیا ہے تم سے، مگر صرف اس لیے کہ مجھے اپنا قول نبھانا تھا، تم سے کیے گئے وعدوں میں ایک یہ بھی وعدہ تھا کسی بھی ناموافق حالات میں پیچھے نہ ہٹنے کا۔

جھوٹ بول رہے ہو تم۔ وہ اچانک ہسٹریائی انداز میں گ بڑھی اور اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی۔

جھوٹ ہے یہ سب۔ اس پر اچانک دیوانگی طاری ہو گئی تھی اس کی انگلیوں میں سجاوِل کا دبا گریبان چر کے کے ساتھ پھٹ گیا۔

تم نے کوئی وعدہ نہیں نبھایا تم صرف ادا سائیں کو بابا سائیں کے سامنے سرخرو ثابت کرنا چاہتے تھے اور انہیں بیٹے کی بغاوت کے ہاتھوں شکست دینا چاہتے تھے تم مجھے ادا سائیں کے ساتھ واپس بھیج دیتے تو یقیناً وہ بابا سائیں کی متح ہوتی۔ مگر نہیں تم نے بہت دور کا سوچا سجاوِل، اپنا فائدہ اپنی تسکین اپنی متح کا سوچا صرف اور صرف بابا سائیں کی شکست اور اپنی فتح کا۔

میری حیثیت تمہاری نظر میں دو کوڑی کی نہیں تھی؛ میں نے تمہیں جو سمجھا، تم وہ تو نہیں



نکلے، تم تو بہت عام سے انا پرست، مہوِ ق پرست مرد نکلے۔ اپنے مفاد کا سوچنے والے،  
اپنے نفع و نقصان کا حساب لگانے والے، تم نے میرے کسی خواب کی تعبیر نہیں دی میری  
رزو کی تکمیل نہیں کی بلکہ اپنا حساب یہاں کیا ہے۔

بولو جواب دو میں جھوٹ بول رہی ہوں یا سچ۔

وہ عالم دیوانگی میں بھی، ساتھ ساتھ رو بھی رہی تھی اسے جھنجھوڑ رہی تھی مگر اونچے قد کا ٹھہکا  
سجاد بالکل بھی لڑکھڑایا نہیں تھا۔ وہ تو کسی چٹان کی طرح ایستادہ تھا۔ تاہم اس کے اعصاب  
پر اس کے یہ حملے کوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔

ہستہ ہستہ اس کے چہرے کے حساس حصوں پر سرخی پھیلنے لگی، سامنے اس کے دونوں  
ہاتھ ایک جھٹکے سے اپنے گریبان سے جھٹک دیے اور پلٹ کر کمرے سے نکل گیا۔ وہ وہیں فرش  
پر نڈھال ہو کر بیٹھ گئی۔

ادا خیر تو ہے۔ اسے بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر بلقیس بھاگ کر اس کے  
پچھے نئی تھی زیمیل کی سسکیاں وہ سن کر پریشان ہو گئی۔ اس نے دروازے کی چوکھٹ پر ہاتھ  
رکھے ذرا گھوم کر بلقیس کو دیکھا۔

اندورنی خلفشار اس کے چہرے پر سرخی کی صورت رقم تھا۔

جاؤ اندر زیمیل کے پاس جاؤ، اس وقت اسے تمہاری تسلیوں کی ضرورت ہے۔

معاف کرنا ادا، اسے میری نہیں تمہاری ضرورت ہے۔ جانے کیسے بلقیس نے جی کڑا کر کے

کہہ دیا۔

ایک دوپل وہ اس کی طرف دیکھتا رہا پھر زور سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔  
اتنے ظالم تو تم کبھی نہیں تھے ادا سائیں پھر یہ خول کیوں چڑھا رکھا ہے، میں جانتی ہوں  
اس خول کے اندر تو ویسا ہی سٹھا دھیمہ پیرا سجاوِل ہے۔ جس کا دل زینل کی محبت  
سے لبالب بھرا ہے بھلا ادا چل کا بدلہ اس بیچاری سے کیا لینا ادا۔  
بلیقہس دروازہ بند کر کے دل پر رنج لیے اس کے کمرے کی طرف چل دی سجاوِل نہ سہی وہ  
تو اس کے سلگتے تپتے نسو پونچھ سکتی تھی۔

کمرے کے گھوڑا اندھیرے میں یکلخت روشنی ہو گئی اس نے نکھوں سے بازو ہٹا تو ماسی  
زرینہ اس کے بیڈ کے سرہانے کھڑی تھیں۔  
اماں پ۔ وہ اٹھ بیٹھی، تب دروازہ کھول کر سجاوِل بھی اندر داخل ہوا۔  
خیر تو ہے اماں۔ اس نے سب کے چہروں پر غیر معمولی پن محسوس کر کے دھڑکتے دل  
کے ساتھ پوچھا۔

تمہارے لیے خیر کی خبر نہیں ہے، البتہ ہمارے لیے خیر ہی خیر ہے۔  
سجاوِل۔ ماسی زرینہ نے پلٹ کر سجاوِل کو غصے اور ناراضگی سے دیکھا۔  
شرم نی چاہیے تھے، کیوں اس غریب کے پیچھے پڑ گیا ہے جب یہی کچھ کرنا تھا تو کیوں

ہامی بھری تھی نکل جا کرے سے۔

نہیں اماں، اسے کہنے دو اچھا ہے جو زہر ہے وہ نکل جا۔ اس نے بڑی گھائل سی نظریں  
سجاول پر ڈالیں پھر جھکا دیں۔ ماسی زرینہ اس کے نزدیک بیٹھ کر اسے پیار سے سہلانے  
لگیں۔

میرے اندر کوئی زہر نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ خبر سنایا یا ہوں کہ وڈیرہ حق نواز پولیس کی  
حراست میں ہے۔ وہ دو قدم گئے یا اور گویا اس کے سر پر بم ہی دے مارا۔  
کمریمین یکخت سناتا پھیل گیا، ماسی زرینہ کی پلکیں رنج سے جھک گئی دواڑے کا پردہ  
تھامے کھڑی بلقیس نے بہت دکھ کے ساتھ زبیل کو دیکھا۔ جو اس خبر پر  
بیجان سی بیٹھی رہ گئی تھیں۔

میں ج گوٹھ گیا تو خبر ہوئی کہ عزت دار وڈیرہ حق نواز سلاخوں کے پیچھے بڑی بھسی کی  
تصویر نظر رہا ہے۔ بہت مقدمے ہیں اس پر۔  
بس کرو، پلیز بس کرو۔ وہ کرب سے چلائی۔

اس کے اعصاب بری طرح متاثر ہوتے تھے۔ اس نے تھر تھراتے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر  
اپنی سسکیاں دبانا چاہیں مگر دوسرے پل ماسی زرینہ کے مہربان بازو اسے اپنی پناہوں میں  
لینے کو گے بڑھے تو وہ ان کے سینے میں سما کر سکنے لگی۔

جاسجاول، اللہ کے واسطے کمرے سے نکل جا، تو اتنا ظالم ہوگا میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ وہ



میٹے کو غصے اور دکھ سے دیکھنے لگیں۔

اماں، اس میں میرا کیا قصور ہے میں نے تو انہیں جیال نہیں بھجوا یا۔ اس نے کندھے اچکا کر اماں کی طرف دیکھا جنہوں نے غصے سے رخ پھیر لیا۔

ٹی ایم سوری زیمیل حق نواز، مگر یہ حقیقت ہے اور میں یہ سفاک حقیقت تم سے جھپا کر تمہارے ساتھ زیادتی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ایک نظر روتی ہوئی زیمیل پر ڈالی اور پھر کمرے سے نکل گیا۔

زیمیل کو لگ رہا تھا اس کا کلیجہ پھٹ جا گا۔ بابا سائیں کو مزاملے۔ ایسا تو اس نے کبھی تصور میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس کا باپ تھا۔ اس کی ماں کا سہاگ حویلی کا سا بان۔

دوسری صبح وہ سب گوٹھ جا رہے تھے وہ رات بھر کی روئی اتنی مڈ حال تھی کہ اس سے اب ایک قدم چلنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ سجاد ل کمرے سے نکلا تو ٹھٹھ گیا وہ اپنی سیاہ چادر سے

نکھیں رگڑ رہی تھی سرخ سرخ ستا ہوا چہرہ رات بھر کی جاگی متورم نکھیں اور

اس پر خشہ گامی۔ اس کی شکست جاں نے اس کا دل ہلا کر رکھ دیا۔

وہ اس کی طرف یا اور نرمی سے اس کے شانے پر اپنا بازو پھیلایا۔

تم چاہو تو ان سے جا کر مل بھی سکتی ہو۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔ اور حویلی میں چند دن رہنا چاہو تو رہ لینا۔

اس نے متورم نکھیں اوپر اٹھائیں، پھر جھکا دیں اور اس کا ہاتھ جھٹک دیا اس کی

پگھلا دینے والی قربت سے دور بٹ گئی۔ جس کی نچ اس کی رگ رگ کو جلانے لگی تھی۔

تم بھول رہے ہو سجاد علی شاہ، میں اتنی مہربانیوں کے قابل نہیں ہوں۔

زیل۔ اس نے اس کا ہاتھ تھامنا چاہا مگر وہ گ بڑھ گئی۔

میں جانتی ہوں تم بہت خوش ہو، مگر میں تمہاری اس خوشی میں شامل نہیں ہو سکتی، سوری

سجاد، اتنا حوصلہ نہیں ہے میرے پاس، وہ میرا باپ ہے جیسا بھی ہے، مگر میری رگوں میں ان

ہی کا خون ہے، مجھے ج بھی ان سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔ وہ بغیر پلٹے بولی، پھر بلقیس کی طرف

بڑھ گئی جو کمرے کے دروازے کو تالا لگا کر نکلی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی باہر گاڑی میں جا کر بیٹھ

گئی۔

سجاد خود بھی چپ چاپ کر بیٹھ گیا۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر

انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

یہ وہ سحر تو نہیں جس کی رزولے کر

چلتے یا رکھ مل جاگی کہیں نہ کہیں

فلک کے دشت میں تاروں کی خرح منزل

کہیں تو ہوگا شب ست موج کا ساحل

کہیں تو جا کے رکے گا سفینہ غم دل

پیار تھا۔

اچھا کتنی؟ اس نے چائے کا کپ لیوں سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ اس لمحے اس کی خوبصورت نکھوں میں بے تحاشا چمک تھی۔

بہت زیادہ پتا ہے ادا، میں اس سے تمہاری بہت سی باتیں کرتی ہوں۔ وہ بڑی خوش ہوتی ہے سب سن کر۔ تم نے اتنا بہت سا پڑھا ہے اسے سب خبر ہے۔

جانتا ہوں۔ اس نے جیسے سامنے بیٹھی بے خبر بلقیس سے نگاہیں چرا لیں۔

سارا دن بس باتیں کئے جاتا۔ اماں کمرے سے باہر نکلیں۔ چل جا، پانی دے مجھے۔ وہ سامنے چار پائی پر بیٹھ گئیں۔ بلقیس کے اٹھتے ہی وہ سجاوٹ کی طرف متوجہ ہوئیں۔

پھر تو نے کیا سوچا، مہتاب خان کے پٹ (بیٹے) کے سلسلے میں۔ بچل کی صلاح تو یہی ہے کہ جلد از جلد اس چھوری کو اپنے گھر کا کر دیں۔ لڑکا اچھا ہو، اپنی زمین ہو، اپنا گھر ہو تو پھر کیا دیکھنا ہوتا ہے۔ کیوں پٹ (بیٹے) تیرا کیا خیال ہے۔ بچل تو لڑکے سے مل بھی چکا ہے۔ اسے تو کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ تیرے ابا بھی راضی ہیں۔ بلقیس اماں کو پانی دے کر فوراً وہاں سے چلی گئی تھی۔

اری اماں، میں ٹھہرا جا بل گنوار۔ اسے میری صلاح سے کہاں اتفاق ہوگا۔ یہ پڑھا لکھا ہے، خود سوچنے دے اسے۔ اسی لمحے بچل اندر داخل ہوا۔

بے شک تعلیم اچھے برے کی تمیز سکھاتی ہے۔ سمجھ بوجھ عطا کرتی ہے۔ پر ادا تم بڑے ہو



اتنے دنوں اس نے حویلی میں قدم رکھا تو نکاحیں یوں جل تھل ہو گئیں جیسے سیلاب کی زد میں یا ہوا گاؤں۔ عابدہ بھاگ کر ئی تھیں اس کی مدد کی چہر سن کر، گھر کی ساری عورتیں اس سے مل رہی تھیں۔

اماں تو جیسے برسوں کی ترسی ہوئی اس کو چوم رہی تھیں۔ اور وہ اپنے نسوؤں سے نڈھال بابا سائیں کا پوچھے جا رہی تھیں۔

سب ٹھیک ہو جا گا۔ تو کیوں فکر کرتی ہے۔ سلطان شاہ نے اسے ڈھارس دی۔  
سچ کہہ رہے ہو ادا، بابا سائیں کو سزا تو نہ ہو گی نا۔  
گمران پر اتنے مقدمے۔

میں نے کہا نا، سب ٹھیک ہو جا گا یہ بتا سجاد خود کہاں ہے، اور یہ تو نے رورو کر اپنی کیا حالت بنالی ہے بابا پہلی بار حویلی کی ہے ذرا ججج کرتی، اماں عابدہ بھی اس کی خاطر مڈارت تو کروپ لوگ بھی بس رونے بیٹھ جاتی ہو۔ اس نے کہا تو سبھی کو ہوش گیا۔ اماں اسے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے گئیں۔

اس نے بابا سائیں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو سلطان شاہ نے منع کر دیا۔

ادی، سلطان جھوٹ بول رہا ہے ناں، بابا سائیں پر بہت مقدمے ہیں نا۔ رات کے کھانے کے بعد وہ عابدہ کے ساتھ اپنے اسی پرانے کمرے میں گئی تھی۔

ہاں، وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ عابدہ صاف گوئی سے بولیں پھر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں

لے کر نکلنے لگیں۔

یہ تو اور میں بلکہ سب جانتے ہیں کہ ان پر ڈھیروں مقدمے بن سکتے ہیں، پر ادا اس لیے تجھ سے کہتا ہے، فکر نہ کر کہ بابا سائیں ایک بڑے زمیندار جاگیردار ہیں ان پر جتنے بھی مقدمے ہوں۔ وہ روپوں کے زور سے ختم بھی ہو سکتے ہیں۔  
یہ پیسہ یہ اقتدار بہت طاقتور چیز ہے۔ انہوں نے چاکلگ اس کی طرف بڑھایا۔ پھر خود لے کر اس کے سامنے بیٹھ گئیں۔

ہاں ادی پر رشتوں کی محبت بہت سی حقیقتوں سے نظریں چرانے پر مجبور کر دیتی ہے، میں تو بس بابا سائیں کی رہائی کے لیے دعا گو ہوں ان سے ایک بار ملنا چاہتی ہوں اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگنا چاہتی ہوا دی۔

میں نے اپنی خواہشوں کے ہاتھوں ان کی نافرمانی کی ہے وار شاید یہ اس کا نتیجہ ہے کہ میں خوشیوں کو اب تک ترس رہی ہوں، خالی دامن ہوں ادی، میری ہاتھوں میں جو بھکتے پھول دکھائی دے رہے ہیں نایہ پھول نہیں انکارے ہیں جنہیں میں نے بھی پھول کے دھوکے میں تھا ماتھا اور۔

اس نیچا کا لگ سا ایڈنیل پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ عابدہ متحیر رہ گئی اور یقینی سے زینل کو دیکھنے لگیں۔

زینل تو اسکے ہونٹ کھلے مگر کپکپا گئے۔

ہاں ادی۔ میں خوش نہیں ہوں خوشی کیا ہوتی ہے میں تو اب تک اس کے معنی ہی نہیں جان پائی کسے کہتے ہیں یہ ہوتی کیا ہے کیسے دل کی روح کو شانت کرتی ہے۔ میرے من میں تو مسلسل گجل رہی ہے بس۔

کیا کہہ رہی ہے ذیل۔ کیوں، تو بھلا خوش کیوں نہیں ہے، کہاں ہے سجاد، اس نے تو تجھ سے اپنی رضا سے شادی کی ہے پھر پھر یہ۔ عابدہ اپنی جگہ سے انھیں اور اسے جھنجھوڑنے لگیں۔ غم اور حیرت سے ان کے اعصاب شل ہو گئے تھے۔ ایک بوجھ ن گرا تھا۔ اس نے سلگتی نکھیں اٹھا کر عابدہ کو دیکھا۔

شادی کوئی خوشی کا نام نہیں ہے، کسی کو پانے کا یا اپنی فتح کا نام نہیں ہے، اس نے شادی تو کی ہے پر۔۔۔ جھوڑ چھوڑ ادی تو نہیں سمجھے گی۔ وہ دگرنگی سے اس کا ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ اور اضطرابی انداز میں بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگی۔

مجھے بتا ذیل، کیا ہو رہا ہے، تیرے ساتھ، کس بات کی سزا مل رہی ہے تجھے۔ عابدہ ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے انھیں اور اس کی کلائی پکڑ کر کھینچی مگر وہ چپ رہی لیکن اس کا چہرہ اس کی نکھیں اپنی داستان سناریتے۔ اس کا ملبول چہرہ عابدہ کے دل کو مسل رہا تھا انہوں نے اسے بازوؤں میں بھر لیا۔

میں تو سمجھ رہی تھی کہ بابا سائیں کا سن کر تیرا یہ حال ہوا ہے، مجھے کیا خبر کہ تو۔۔۔ ذیل، میری دھی تو تو اجڑی ہوئی لگ رہی ہے ہم تو تجھے اپنے گھر باد سمجھ کر مطمئن تھے مجھے بتا چری کیا



دکھ ہے تجھے۔ انہوں نے اسے خود سے لپٹا لیا تو اس نے بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے انہیں سب کچھ بتا دیا۔

اس لمحے اسے کسی غمگسار کی طلب ہو رہی تھی جو اس کے تپتے صحرا جیسے دل پر ٹھنڈی پھوار جیسی تسلی رکھے۔

میں اب اس حویلی سے کہیں نہیں جاؤں گی ادی، میرے مقدر میں یہی حویلی ہے۔ سجاوِل تو اسے منع کر دینا۔ جب یوں بھی تنہا رہنا ہے تو یہاں پڑے رہنے میں کیا برائی ہے۔ اس کی بیرغی بیگانگی اور زشت بھر جملوں کے زخم کھانے سے تو یہاں اکیلے رہنا بہتر ہے۔ اس نے عابدہ کی گود میں سر رکھ دیا تو عابدہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی مگر وہ نکھیں موندے پڑی رہی۔

ادا سائیں بھی پوچھے تو کہہ دینا کہ یہ ٹھہرنے لئی ہے کچھ ہفتے، اماں اور سب کو یہی بتانا ہے۔

مگر زیمل، یہ کوئی حل تو نہیں، مجھے ایک بار سجاوِل سے بات کرنے دے۔ میں اسے۔ نہیں ادی۔ وہ جھٹک سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے چہرے پر تناؤ تھا۔

مجھے ابمانگے کی محبت، بھیک میں ملی ہوئی عزت نہیں چاہیے۔ بہت جھک گئی میں، اب میری انا گوارا نہیں کرتی۔ وہ شخص اپنے زخموں کو کھرچ کھرچ کر خود کو ہی نہیں مجھے بھی اذیت دیتا رہتا ہے۔

دکھ کی گرفت میں صرف وہ ہی تو نہیں یا، اماں بابا ادا علی، بلقیس، سب کا ہی مشترکہ غم

ہے، اسے شاید اب یاد رہا ہوگا ادی کہ میں وڈیرہ حق نواز کی بیٹی ہوں مجھ سے اس نے وڈیرے کی بیٹی سمجھ کر ہی شادی کی ہے اور اب اپنے دکھوں اپنے نقصانوں کا حساب بھی یہی سوچ کر لے رہا ہے وہ ایک ظالم، سفاک انسان ہے۔ ادی، اسے گوٹھ والوں کی مظلومیت رلاتی ہے مگر میرے نواسے ذرا نرم نہیں کرتے میرے لیے ایسی چٹان بن گیا ہے جس سے ٹکرا کر میرا وجود ٹکڑے ٹکڑے ہو جا گا ادی۔

عابدہ دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر بیٹھ گئیں۔ انہیں کچھ بھی بھائی نہ دے رہا تھا۔ ذہن بالکل مفلوج اور مآؤف محسوس ہو رہا تھا۔ بس دل تھا کہ زیمیل کے سلگتے نسوؤں سے بھرا جا رہا تھا۔ انہیں اپنی رگوں میں ابھو کی بجائے انگارے دوڑتے محسوس ہو رہے تھے۔

انا ہے تم میں بھی تھوڑی بہت بتانا اسے

وہ اب ملے بھی تو مت حال دل سنانا اسے

اکیلے کس سے اٹھا ہے تعلقات کا بوجھ

وہ تم کو یاد نہ رکھے تو بھول جانا اسے

وہ جس گ میں جل رہی تھی اس کی کھولن شادیاں کا اپنا دل ہی جانتا تھا ادی

عابدہ نے چارہ گر کی طرح اس کے تپتے دل پر مہربان ہاتھ رکھا تھا مگر وہ اس کے زخموں

کی گہرائی میں کہاں اتر سکتی تھیں۔

اس نے درتے چمچے کا پٹ بند کر کے اسی سے ٹیک لگا کر جلتی کھچیں موند لیں۔

ابھی کچھ دیر پہلے اس نے ملازمہ لڑکی کے ہاتھوں۔ اسے لینے والے سجاوے کو انکار  
کہلوا بھیجا تھا اور ملنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

مگر کیا سجاوے، اتنا نادان تھا کہ وہ اس کے اس پیغام میں چھپے گریز کو نہ سمجھتا۔  
اس نے اپنی کھڑکی سے دیکھا تھا وہ پورچ سے نکل رہا تھا اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ  
اس کا یہ پیغام اس کے لیے غیر متوقع تھا۔

زیمیل۔ عابدہ دروازہ کھول کر اندر آئیں ان کے چہرے پر تشویش جھلک رہی تھی۔  
یہ کیا پاگل پن ہے کیا چاہتی ہے تو کہ یہ بات پورے گوٹھ میں پھیل جا۔  
میں اس الاؤ میں واپس نہیں جاؤں گی ادوی جہاں میرے سارے سنے ساری خوش فہمیاں  
سارے جواب را کھ ہو گئے۔ وہ قطیعت سے کہہ کر مزید سوال جواب سے بچنے کے لیے ہاتھ  
روم میں جا کر بند ہو گئی۔

دوسرے دن سلطان اس کے کمرے میں آیا وہ بیدلی سے بیڈ کی پائنتی سے ٹیک لگا قالین پر  
بیٹھی تھی اس کی اجازت زندگی کا عکس اس کے چہرے پر پھیلا تھا۔ سلطان شاہ کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ  
سے کھری ہو گئی دوپٹہ کھینچ کر سر پر ڈالا۔

بابا سائیں سے ملنا چاہتی ہو۔ اس نے کہا تو اس کے ویران چہرے پر گویا بہار کا رنگ اتر  
یا۔

ہاں ادا کیا وہ رہا ہو کر حویلی گئے۔ یہ کہہ کر ایک پل اس کا دل خوف کی دلدلی



زمین میں دھنسا تھا۔ اسکے چہرے پر خوشی کی بجا خوف سٹ یا۔

نہیں، ابھی رہائی نہیں ہوئی۔ تو فکر نہ کر ہو جاگی یہ معاملہ چند ہفتوں میں تو نہیں بنے گا نا۔ و میرے ساتھ مگر ہاں ذرا اپنا حلیہ درست کر لو۔ بابا سائیں تمہیں خوش باش دیکھنے کے متمنی ہوں گے۔

یہ کہتے ہو اس نے بغور اس کی طرف دیکھا اس کی نظریں اس کے چہرے پر یوں مرکوز تھیں جسے وہ اس کے دل کے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہا ہو۔

زیمل کی لمبی دراز پلکیں جھک گئیں۔ وہ اضطرابی انداز میں لب کاٹنے لگی۔

سلطان شاہ کے چہرے پر چھائی سنجیدگی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

میں تمہیں اتنا پاگل نہیں سمجھتا تھا، خواب ہم بھی دیکھتے ہیں، زیسے، سنے ہماری نگہوں کے پار بھی لہراتے ہیں پر چری، یہ پھول نہیں ہوتے کہ باغ میں پہنچتے ہیں ہاتھ بڑھا کر اپنی پسند کے توڑ لیں گے۔

یہ دنیا یہاں قدم قدم پر حقیقتوں کی تلخیوں سے خوشیاں بھی کشید کرنا پڑتی ہیں۔ یہاں کی خوشیاں سر تیں ٹرے میں سجا کر تمہیں نہیں ملیں گی۔ جنت نہیں ہے یہ دنیا۔ اس نے گ بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ۔

چل جلدی تیار ہو کر نیچے جا۔ وہ پلٹ کر کمرے سے چلا گیا۔ وہ کتنی دیر دروازے کے کھلے پٹ کو ششدر کھڑی دیکھتی رہی۔

تو کیا ادا سائیں کو خبر ہو گئی کہ وہ کس عذاب سے گزر رہی ہے۔

اس نیزے تھکے انداز میں سوچا پھر سر جھٹک دیا۔

بابا سائیں سے ملنے کی خزشی میں وہ سار سوچوں کو جھٹک کر ان سے ملنے کو پھر سے بیتاب دکھائی دینے لگی۔

وہ جب سلطان کے ساتھ گاڑی میں کر بیٹھی تو اس کا دل خوف سے دھڑکنے لگا۔

ادا، بابا سائیں تو مجھ سے بہت ناراض ہیں وہ میری صورت دیکھنا گوارا نہیں کریں گے وہ

مجھ سے نہیں ملے تو ارے نہیں، انہوں نے تم سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ پاگل وہ باپ

ہیں تیرے چاہے کتنے ہی پتھر ہوں، لیکن اولاد کیل یے ریشم ہوتے ہیں۔

سلطان شاہ کی باتوں نے اس کے ڈوبے دل کو سہارا دیا۔

اور واقعی بابا سائیں اسے دیکھ کر بہت خوش دکھائی دینے لگے۔ وہ تو انہیں دیکھ کر ضبط کھو

بیٹھی۔ اپنے سارے ہی نسو بہا دینے کو تیار تھی جو سجاوہ کی طرف سے بھی ملے تھے۔

ٹھنڈی چھاؤں ملی تو پچھلی ساری اذیتیں یاد گئیں۔

مجھے معاف کر دینا میری بھڑی، میں نے بہت کچھ کھو دیا ہے اپنے غرور اپنے غصے میں،

دھی رانیاں تو بہت نازک ہوتی ہیں ذرا سی دھوپ سے مرجھا جاتی ہیں پتی پتی بکھرنے لگتی ہیں

میں نے تیرے سر سے چھاؤں ہی کھینچ ڈالی۔ اگر سلطان نہ ہوتا تو شاید میں ایک اور ناقابل

تلافی نقصان سہارا رہا ہوتا۔

بابا سائیں۔ وہ ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر لبوں سے کبھی نکھوں سے لگا کر روتی رہی۔ وہ کچھ بولنا چاہتی تھی مگر نسو بہنے لگتے تھے۔

وہ جب بابا سائیں سے مل کر باہر آئی، تو یہ دیکھ کر ٹھٹھ گئی کہ سجاوٹ علی شاہ بھی باہر موجود سلطان سیپاہیں کر رہا تھا جو بابا سائیں کے مقدمے سے متعلق ہی تھیں۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہی اور ذرا سارخ موڑ لیا۔ تب اسے دیکھ کر سلطان نے پکار لیا۔

زیمیل۔ وہ وہیں سے اسے پکار رہا تھا نا چار اسے اس کی طرف جانا پڑا۔

ٹھیک ہے پھر سجاوٹ تم کل یہیں جانا ہم یہیں سے کچھری چلیں گے تمہارے نے سے یقین کرو مجھے بڑی ڈھارس ملی ہے، اور بابا سائیں کو بھی۔ سلطان کے لہجے میں سجاوٹ کے لیے محبت اور ممنونیت تھی۔ پھر اس نے سجاوٹ کی لائی گاڑی کا دروازہ کھول کر زیمیل کو خطاب کیا۔ بیٹھو۔

ادا۔ اس نے ابھی نظروں سے سلطان کو دیکھا مگر اس کے چہرے پر بھدختی اور سرد مہری رقم تھی۔ وہ چپ چاپ سیٹ پر بیٹھ گئی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر سجاوٹ کر بیٹھا تو اس کا دل پہلو میں دھڑک کر رہ گیا، (ادا سائیں میرے ساتھ تم اچھا نہیں کر رہے) اس کا دل بیچارگی اور کرب سے دو چار ہو گیا۔

تو تمہیں سب خبر ہے مگر بجا اس ظالم شخص سے باز پرس کرنے کے۔ پھر مجھے اس کے ساتھ اس جہنم میں دھکیل رہے ہو۔ ہونا خیر رئیس سلطان شاہ عورتوں کے غموں کی گہرائی کو کہاں



جان سکتے ہو۔

گاڑی ریلتی ہوئی گے بڑھ گئی وہ سر جھکا بیٹھی رہی۔ ایک نظر پلٹ کر سلطان پر نہ ڈالی جس کے لبوں کی تراش میں مدھم مسکراہٹ تھی نہ ہی سجاول پر ڈالی جو گا ہے بکا ہے درز دیدہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

گاڑی جب گوٹھ کے راستوں پر چلنے لگی تو اس نے ایک خوبصورت قدرے سنسان جگہ گاڑی روک دی س پاس سبزہ ہی سبزہ تھا حد نگاہ تک خریف کے دو شالے سوکھ رہے تھے۔ درختوں کے سبز پتوں سے پانی ٹپک رہا تھا، سارا ماحول مہک رہا تھا۔ ساری فضا کھنک رہی تھی مگر زیل حق نواز کو کوئی تازگی کوئی نفیسی محسوس نہ ہو رہی تھی۔ گاڑی رکنے پر اس نے نظریں اوپر ضرور اٹھائیں مگر سجاول کو اپنی طرف دیکھتا پا کر جھکالیں اور چہرے کا رخ کھڑکی کی طرف کر لیا۔ مجھے حویلی میں چھوڑ دینا۔

تم شاید بھول گئی ہو۔ اب حویلی میں تمہارے لیے کچھ نہیں رہا۔ وہ دونوں ہاتھ اسٹیرنگ پر رکھے اسے بغور دیکھنے لگا۔

کرب کا ایک رنگ اس کے چہرے کو چھو گیا۔ اس نے ہونٹوں کو زور سے دانتوں میں دبایا۔

کیا چاہتے ہو سجاول۔ اس کی واز بے حد پست تھی۔

میرے، تم نے اچھا ہی سوچا ہوگا بلقیس کے لئے۔ سجاوِل اس کی بات کا برا مانے بغیر بولا اور چائے کا کپ لے کر کھڑا ہو گیا۔

کیا تمہاری تعلیم تمہیں دوسروں کا ادب و احترام کرنا نہیں سکھاتی؟ اس نے چونک کر پھل کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ سجدہ تیکھا تھا۔ وہ قطعی سمجھ نہ سکا۔

رئیس مہراں شاہ تمہارے رویے پر بہت غصہ ہوا ہے۔ تم نے انہیں سلام نہیں کیا۔ وہ وڈیرہ حق نواز کا بیٹا ہے اس گوٹھ کا چھوٹا رئیس۔

شکایت کی ہے اس نے تم سے؟ اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

نہیں، میں کون سا کہیں کار رئیس سردار ہوں کہ وہ میرے منہ لگے گا۔ وہ چاہتا تو سزا بھی سنا سکتا تھا تجھے۔ پھل نے پیروں سے پھل اتارے ہوئے بلقیس کو وا زدی مگر چھنا کے کی وا ز پر اچھل پڑا۔ سجاوِل نے چائے سے بھر اگ زمین پر دے مارا تھا۔ اس کا چہرہ لال انگارہ ہو گیا تھا اور نقوش تن گئے تھے۔

بس ہماری اسی سوچ نے ان وڈیروں، جاگیرداروں اور سرداروں کی پگڑی کو سنبھال رکھا ہے۔ زر خرید غلام نہیں ہوں میں کہ جہاں سے بھی گزریں وہاں نکھیں بچھا دوں ان کے لیے۔ سر جھکا کر، ہاتھ جوڑ کر ان کی تعظیم میں کھڑا ہو جاؤں۔ وہ مجھ پر، میری ذات پر کوئی حق نہیں رکھتے۔

سجاوِل بلقیس گھبرا کر دونوں ہاتھوں کے درمیان کھڑی ہوئی۔ ادا تو بس یوں ہی اک

ماضی کی وہ سستی مسکراتی سپنے دیکھنے والی زمیمل کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس نے اچانک اس کا رخ اپنی طرف کر لیا۔  
کہاں گم ہو گئی ہے وہ۔

اس نے بڑی گھائل نظریں اس پر ڈالیں۔  
اسے تو تم نے ہی زندہ درگور کر دیا ہے، اس کیسارے خواب ساری رز وؤں کو کچل ڈالا ہے، سپنے دیکھنے والی نکھوں کو اتنی سزا دی ہے کہ۔۔۔ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ کر رونے لگی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر نرمی سے اس کے دونوں کانپتے ہاتھ اس کے چہرے سے ہٹا کر اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔  
چھوڑو۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹکنے لگی۔

جذبے کوئی کھیل نہیں ہیں سجاو ان میں دل خرچ ہوتا ہے جاں خرچ ہوتی ہے ہے۔ اور تم میرے جذبوں کو میرے خوابوں کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں تھے۔ اس کے نسو تو اتر سے بنے لگے وہ گے بول نہ پائی۔ سجاو نے بڑے پیار سے اس کا سراپنے شانے سے لگا دیا۔

میں چاہتا ہوں تم جی بھر کر رولو وہ سارا غم بہادو جو وقت ہماری جھولی میں ڈال گیا ہے۔  
وقت نہیں۔ تم نے، تم نے دیا ہے یہ غم یہ دکھ۔ وہ کرب سے چلائی۔



ہاں، یو میں ہی اس مداوا بھی کرنا چاہتا ہوں، میں ہی ازالہ کروں گا۔ اس کی واز دھیمی  
محبت کی مہک سے بھری ہوئی تھی۔

زیمیل کا دل جیسے ٹھہر گیا اس نے چہرہ اوپر اٹھایا تو وہ نکھوں میں محبت کا ایک جہاں لیے  
اسے دیکھ رہا تھا پھر اس کی بھیگی نکھوں میں جھانکتے ہو بولا۔

ہم دکھ سے وہ بوجھل لمحے، وہ ساری باتیں کیوں نہ بھول جائیں وہ ادا اس کر دینے والی  
سوچیں کیوں نہ جھٹک دیں۔ اس کے لہجے میں نرمی تھی اس کی نکھوں میں موجزن بی  
لہروں میں روانی گئی۔

یقین کرو، تمہیں جلا کر میں نے بھی کوئی سکون نہیں پایا۔ میں تم سے کوئی دانستہ انتقام نہیں  
لیتا تھا زیمیل۔ وہ میری لاشعوری حرکتیں تھیں شاید میں جس گ میں جل رہا تھا۔ اس وقت  
مجھے صرف اس گ کے اٹھتے شعلوں کے علاوہ کچھ اور بھائی نہیں دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ اپنی  
ذات بھی، میں تمہاری جانب قدم بڑھاتا تو دل پر بوجھ بڑھ جاتا تھا خود کو خود غرض اور نفس  
پرست خیال کرنے لگتا تھا۔

مگر سوچتا ہوں اب کہ وہ سب ہوتا تو تقدیر میں لکھا تھا اس میں کسی کا کیا دوش جس اذیت  
کا سفر ہم نے کیا وہی تم نے بھی تکلیف اٹھائی بلکہ تم تو کانٹوں سے الجھ کر مجھ تک ٹھنڈی چھاؤں  
کی تلاش میں پہنچی بھی اور میں نے بجا تمہیں چھپر چھاؤں دینے کے تمہیں دھتکار دیا کی ایم  
سوری زیمیل۔ اس کی نکھوں کے سارے موتی سجاول بڑے پیار سے چھنے لگا۔

اس کی وار، زیمیل حق نواز کی سماعتوں پر یوں اتر رہی تھی جیسے صحراؤں میں بادِ نسیم چلنے لگی ہو جیسے سوکھی کھیتی پر برکھارت کا سندیسہ لانے والی پھوار گرے۔  
وہ حیرت خوشی کے ملے جلے احساسات کے ساتھ بیٹھی رہ گئی تھی۔  
وہ کہہ رہا تھا۔

بڑے پیارے خواب دیکھے تھے میں نے بھی زیمیل۔ مگر حالات نے جو رخ بدلا، تو سب کچھ بکھر گیا، جب خواب ٹوٹتے ہیں تو دل ٹوٹ جاتا ہے جذبے مرنے لگتے ہیں روح ویرانہ ہو جاتی ہے۔ ایسے میں بہار بھی خزاں دکھائی دیتی ہے رنگ میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی، ہمیں یوں لگتا ہوتا ہے جیسے ہم اس متحرک دنیا کا بے کار جزو ہو کر رہ گئے ہوں اب جیسے کبھی نہ فہم سکیں گے دن میں خوشیاں پیدا کرنے والے ولولے جاں بحق ہو چکے ہیں اب کبھی ان میں زندگی پیدا نہ ہو سکے گی۔

مگر یہ وقتی احساسات اور عارضی کیفیت ہوتی ہے کیونکہ یہ قانونِ فطرت نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو ج ہر شخص زندہ لاش کی طرح گھومتا پھرتا دکھائی دیتا اپنے عمر بھر کے دکھوں کو سینے سے لگا شکستہ و افسردہ نظر تا یہ دنیا صرف قبرستان دکھائی دیتی مگر صد شکر کہ ایسا نہیں ہے۔ جو زخمِ وقت دیتا ہے اس کا تریاق بھی قدرت کی طرف سے کیا جاتا ہے۔

سجاوِل نے بڑے پیار سے اس کے بال اس کے چہرے سے ہٹا۔

کیا ایسا نہیں ہے زیمیل۔ اس نے اس کے ہاتھ پر اپنی بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

محبت کی اس حرارت سے زیمیل کے چہرے پر دھنک اترئی وہ تو بے یقینی کی کیفیت

میں سانس روکے بیٹھی تھی۔

اسکی خوبصورت نکھوں میں بہت سے جگنو چمک اٹھے تھے۔

تم سے نفرت کا تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ پاگل۔ کل تک مجھے ٹھنڈی ہوا کے لطیف جھونکے بھی اذیت دے رہے تھے۔ سورج کی پرفیم گرمی میں بھی لطافت محسوس نہ ہو رہی تھی مگر جیسا نہیں ہے۔ شکر ہے یہ کیفیت دانی نہیں ہوتی دکھ ہلکے ہو جاتے ہیں ورنہ کتنے رشتے چھوٹ جائیں ہمارے ہاتھوں سے کتنی محبتیں ہم کھودیں۔

دیکھو زمیں ہر شے سنگسار ہی ہے۔ یہی تو قدرت کا طریقہ کار ہے۔ اس دنیا میں دکھ ہیں اور یہیں سکھ یہاں خزاں بھی تھی ہے اور بہار بھی۔ اور جب بہار جاتا تو خزاں کا دم نکل جاتا ہے مجھے لن یوتا نگ کی نظم کا ایک مصرعہ یاد رہا ہے کہ۔

جب ہوا بہار چلتی ہے تو دل کی کلی بھی کھلنے کو بیتاب ہو جاتی ہے۔

اس کے لہجے اور نکھوں میں سرمستی تھی باتوں میں وہی شرارت اترئی تھی۔

زمین نے لمبی پلکوں کی خوبصورت جھالیں اوپر اٹھائیں تو سجاوٹ کو اپنی طرف دیکھتے پا کر جھکا دیں۔ اس کی نگاہیں اس کی اندر کے شجر میں کسی کو نیل کی مہک ڈھونڈ رہی تھیں۔ اور وہ بند کلی کی طرح خود میں سمٹ گئی۔ اچانک اسے اپنی پوزیشن کا خیال گیا وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی اس کے قرب کی نیچے اسی جھلسانے لگی تھی۔ مگر اس نے اس کے ہاتھ پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔  
بولو، زمیں کچھ کہو گی نہیں۔



کیا کہوں بس تم بولتے رہو سجاو ل کہ بہت اچھا لگ رہا ہے سننا۔ برسوں کی دل کی پیاسی  
دھرتی جیسے سیراب ہو رہی ہے۔

بولتے رہو سجاو ل اپنی محبت کا ایقان دلاتے رہو۔

میری تمام تھنکیاں مٹنے لگی ہیں میرے دل کے اجڑے نگر میں روشنی پھیلتی جا رہی ہے۔  
میں کیسے یہ ظلم توڑ دوں۔ میں اس سحر سے اب کبھی زاد ہونا نہیں چاہتی۔ اس نے اس کے  
شانے پر سر نکا دیا۔

اسی سماں کی چھت تلے

میرا شیاں بھی اڑاں بھی

تیری چشم خوش کی پناہ بھی

میرے خواب بھی میرے مان بھی

زیمل۔ اس نے والہانہ انداز سے اسے پکارا۔

اس کے لہجے کی خوشبو اسے تروتازہ کر گئی۔

کیا واقعی تم نے مجھے دل سے معاف کر دیا۔

سجاو ل کیسی باتیں کر رہے ہو۔ وہ سرائٹھا کر رنج سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ تم نے کوئی  
جرم نہیں کیا جس کی معافی ہو۔

محبت تو جرم نہیں ہے نا۔ اس نیخو دگو بچہ ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہو اس کے چہرے پر پھیلتی

دھنک کودیکھا اس سمت ذرا سا جھکا تو وہ بیساختہ مسکراہٹ کو نہ روک سکی۔

ہے مگر اس کی معافی نہیں ہوتی سزا ہوتی ہے۔

اس نے دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ کہا،

اوہ یہ سزا مجھے یہیں دینا پسند کرو گی یا پھر گھر پر۔۔۔ اس نے شرارت سے اس کی لٹ کو

چھوا۔ تو وہ شرما کر خود میں سمٹ گئی۔

اس کے حسن کی تابندگیاں جھللا نے لگیں تھیں۔

اسے لگا سجاد کی محبت حوض میں ٹھہرا متعید پانی نہیں تھی بلکہ ایک رواں دریا کی طرح تھی

جس کا بہاؤ اسے بہا کر لے جا رہا تھا۔

سجاد لگاڑی چلانے لگا اور پھر اسے ان عمارتوں اور زمینوں کے پاس لے یا جو ریکس

سلطان شاہ نے اسکولوں کے استعمال کے لئے دے دی تھیں۔

حیرت اور خوشی سے اس کا جبرہ چمک اٹھا اسے لگا مسرتوں سے اس کی جھولی چھلکنے لگی ہو۔

میرے سارے خواب پورے ہو گئے زیمیل۔

سجاد بیحد مسرت سے اسے بتانے لگا۔

سجاد، ایک گھر کی طرح، اس وطن کو اس زمین کو حسین اور شرم بار بنانے کے لیے

ہمارے خواب، ہمارے درد، ہماری محبتیں مشترک تھیں نا۔

ہاں زیمیل۔

اب ہماری محنت بھی مشکرت ہوگی میرا دل چاہتا ہے سجاوِل میں ان اسکولوں میں نے  
والے ننھے مئے بچوں کو اپنے ہاتھوں سے اپنی محنت سے سینچوں ان کے دلوں کے قفل کھول کر  
انہیں روشنی سے منور کروں۔ سجاوِل اسے بری محبت اور فخر سے دیکھ رہا تھا۔

کیا ایسا ہو جا گا سجاوِل، کیا ہمارا وطن، ہمارا گوٹھ اندھیروں سے نکل کر روشنی پائیگا۔  
انشاء اللہ بس یقین محکم، عمل پیہم۔۔۔

محبت فاتح عالم۔۔۔ وہ اس کا جملہ پورا کر کے ہنس دی وہ بھی سر کو ذرا سی جنبش دے کر  
ہنس پڑا۔

ان دونوں کی ہنسی میں دکھ کا شائبہ تک نہ تھا۔

یہ ہوا خربش ہے سحر نے کو ہے

رزو کے زرد لہجے میں اثر نے کو ہے

پاسکیں گے بونے والے اپنی محبت کا ثمر

سیپیوں کی ستیوں میں گہر نے کو ہے

ختم ہو جا گا اب یہ سلسلہ بے نشان

شوق کی منزل، وفا کی رہ گزر نے کو ہے

The End-----اختتام



بات کر رہا تھا۔

نہیں، یہ بات نہیں تھی۔ یہ حویلی کا پیامبر بن کر مجھے وارننگ دے رہا ہے کہ سندھ میں بھی ہزاروں بے دام غلاموں کی لائن میں کھڑا ہو جاؤں۔ اس کی نگہوں میں حویلی کے ان مالکوں کے لئے نفرت کے شعلے اٹھنے لگے۔ چل کھول اٹھا۔

اماں اسے سمجھا لے، یہ چار جماعتیں پڑھ کر خود کوریسوں کے برابر کی سطح پر سمجھنے لگا ہے۔ ہونہر ابھی کتابوں کے چند لفظوں کا نشہ ہے۔ شہر کی سڑکوں پر جوتیاں چٹھا کر بھی نوکری نہیں ملے گی تب یہ سارا طغیان برن ہو جائے گا۔ اسی گوشہ اور ان ہی کی زمینوں پر سر جھکا کر کام کرنا پڑے گا۔ شہر میں نوکریاں ملنا سان بات نہیں ہے۔

ہاں اس لئے کہ ان ہی لوگوں نے باثر جگہوں پر پہنچ کر شہروں میں لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ شہروں کی تباہ حالی کے ذمہ دار یہی لوگ ہیں۔ زمینوں پر کام کرنا کوئی برائی نہیں ہے مگر ان کی غلامی کرنا میرے نزدیک شرک ہے، گناہ ہے، بے غیرتی ہے۔ وہ فرش پر بکھرے کانچ کے ریزوں کو روندنا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

دماغ خراب ہے اس کا۔ چل غصہ دباتا چار پائی پر دھیرے سے گرنے کے انداز میں بیٹھ گیا۔ اماں میں غلط نہیں کہتا۔ اس نے سر پر ہاتھ رکھی اماں کی طرف دیکھا۔ اگر اس کی باتیں اس وڈیرے کے کانوں میں پہنچ گئیں تو دیکھ لینا تیرا یہ بیٹا بہت پچھتائے گا اور ہم سب بھی۔ ہم غریب ہاری لوگ ہیں، جتنی کتابیں پڑھ لیں رہیں گے

ان کے قدموں کے نیچے ہی۔ کبھی ہم ان کے برابر نہیں سکتے اماں۔ زندگی اگر یوں ہی گزر رہی ہے، تین وقت کی روٹی مل جاتی ہے، تن ڈھانپنے کو کپڑا اور چھت مل جائے تو کیا برا ہے۔

وہ بے چارہ ان پڑھ جاہل پہلے سے مرغوب اماں کو سمجھا رہا تھا۔ پس پردہ خود کو تسلی دے رہا تھا۔ کمرے میں بیٹھا سجاوٹ بیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔

بس یہی سوچ ایسے ہی خیالات کی پرورش چاہتے ہیں گوٹھ والوں کے ذہنوں میں، یہ جاگیردار لوگ۔ یہی ان کی کامیابی ہے۔ گوٹھ والوں کو تعلیم سے اسی لئے محروم رکھا جاتا ہے کہ ان کی سوچوں کی سطح ہمیشہ ہی اتنی پست رہے۔ ان کے ووٹ، ان کی کرسیاں، ان کی جاگیرداری سلامت رہے۔ چاہے ایک ہی زاویے سے جھکے جھکے وہ ٹوٹ جائیں۔ ان کی انا، خودداری اور غیرت پر جتنی ضربیں لگیں مگر سر بلند کرنے کا تصور بھی پاس نہ پھٹکے۔ یہ جاہلیت کے اندھیرے ان کی اندھی حکومت کو ڈھانپے ہوئے ہیں تاکہ اس تاریکی میں ان کے گندے میلے کچیلے بے ضمیر وجود دکھائی نہ دیں۔

غصے اور بے بسی کے احساس سے اس کی مٹھیاں بھنج گئیں۔ وہ کمرے سے نکلا اور پیروں میں چپل ڈال کر باہر کی طرف بڑھا۔ بلیتیس بھاگ کر اس کے پیچھے تک نئی۔

ادام۔

میں ابا کی طرف جا رہا ہوں۔ انہوں نے بلوایا تھا مجھے، شاید کوئی کام تھا۔ اس نے اس

کے پر تشویش چہرے پر ایک نگاہ ڈال کر وضاحت کی اور پردہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔



غلام محمد، ذرا گاڑی روکنا۔ ذیل حق نواز کے حکم پر ہجیر وکی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالے  
غلام محمد نے جلدی سے بریک پر پیر رکھ دیا۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی۔

اماں اور زینت نے حیرت سے اسے دیکھا۔ بھاگل نے بھی مٹھائیوں کے ٹوکڑے  
کو سنبھالے سنبھالے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ گاڑی یوں بیچ سڑک پر روکنے کی  
وجہ کسی کی بھی تو سمجھ میں نہ کی تھی۔

بڑا جس محسوس ہو رہا ہے۔ یہ جگہ کچھ ٹھنڈی ہے، گرمی بھی لگ رہی ہے۔ اس نے سب کی  
سوالیہ نگاہیں محسوس کر کے وضاحت کی اور اپنی طرف کا پردہ ذرا سا سرکا کر لرزتی پلکوں کی باڑھ  
اٹھا کر باہر جھانکا۔

ہاں موسم اچھا ہو رہا ہے۔ زینت نے بھی اپنی طرف کے شیشے کے پردے سرکا کر باہر کی  
دنیا کو دیکھا۔ اماں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر پھر سوچ کر چپ ہو گئیں۔

سجاول سو مراحویلی کی مخصوص ہجیر وکڑے دیکھ کر ٹھہ گیا تھا۔ یوں ہی سرسری انداز  
میں ایڑیوں کے بل گھوم کر دیکھا تو کتنے ہی پل پلکیں نہ جھپک سکا۔ دو پر شوق نظروں سے بڑا



گہرا تصادم ہوا تھا۔ وہ پھول سا چہرہ سیاہ چادر کے ہالے میں بڑا دلفریب لگ رہا تھا۔ اچانک پردہ سرکا اور جیسے چاندنی چٹک گئی۔ دو گلابی بھرے بھرے دلنشین لب ہولے سے مسکرائے۔ دوسرے لمحے ہجیر و فراٹے سے گے بڑھ گئی۔

جیسے ہر منظر پر روشنی پھیل کر پھر سٹ کر گے دوڑ گئی ہو۔ ہجیر و میں اتنی بہت سی نکمیں دیکھ ہی نہ پائیں کہ وڈیری زیمیل نے اپنے دل کی پیاسی دھرتی کو سیراب کر لیا۔ کوئی جان ہی نہ سکا کہ اسے یوں یکا یک گھٹن کا احساس کیوں کر ہوا تھا۔

اور اب۔۔۔۔۔

ان ہواؤں نے اس کی رگ رگ سے گھٹن کھینچ کر خنکی دوڑا دی تھی۔

یہی ہوائیں تو زینت حق نواز کے چہرے سے بھی نکرائیں تھیں اور بھاگل کو بھی چھو گئی تھیں مگر جو سرشار وہ محسوس کر رہی تھی وہ کسی کو بھی حاصل نہ ہوئی۔

چری ہو گئی ہے یہ تو۔ بے خبر اماں ہنس دی تھی۔ ادھر سجاوہ اپنی جگہ دم بخودان راستوں کو خالی خالی نظروں سے گھور رہا تھا جن پر ہجیر و گزر کر رنگا ہوں سے اوجھل ہوئی تھی۔

وہ نجانے کب تک وڈیری کی اس وارفتگی، بے خودی اور دیوانگی کو اپنے دل کے کونے میں محسوس کرتا کہ امداد علی کا ہاتھ اس کے شانے پر پڑا۔

ہٹ کوئی چار مہینے سے پریشان ہیں ہم مگر اب تو فصلوں کو بہت زیادہ خطرہ پڑ گیا ہے۔

دوسرے لمحے وہ عالم مدہوشی سے عالم خود شناسی میں یا تو اپنے اطراف بابا سائیں اور دوسرے لوگوں کے چہرے دکھائی دینے لگے۔

نوحہ کنناں روتی ہوئی فصلیں اور دکھ ہی دکھ، بے بسی اور بے اختیاری سے جھلسے ہوئے چہرے۔ یہ تو سراسر ظلم ہے ابا۔ یہ پانی کی باری والی بات تو ہم چھوٹے بادگاروں کے لئے سراسر خسارے کا سودا ہے۔

سجاول پٹ اب تو باری کا بھی مسئلہ نہیں رہا۔ وڈیرہ شاہ نواز کے دمیوں نے دھڑلے سے سارے پانی اور پچھلی نہر پر قبضہ کر رکھا ہے۔ فقیر محمد نے اداسی کے ساتھ کہا۔ سجاول کی رگوں میں خون کھولنے لگا۔

پ لوگوں کو محکمے والوں سے بات کرنی چاہیے تھی۔ خریہ نہر سب کی ہے اور پانی پر کسی ایک کی اجارہ داری کیوں ہو۔ میں خود جاؤں گا۔

نہ پٹ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ بڑے لوگ ہیں، زمیندار سراکار لوگ۔ ان کا اس دھرتی کی ہر چیز پر حق ہے۔ یہ محکمے والے ہم جیسوں کو تو منہ ہی نہیں لگاتے۔ ان کی جیبوں میں بڑے لوگ روپیہ بھر جاتے ہیں۔

چاچا یہ ملک اب بڑے لوگوں کی جاگیر نہیں ہے۔ یہ سب کے لئے بنا ہے۔ ہر امیر غریب کے لئے ہے۔ اسے حاصل کرنے والے کے لئے بنا ہے۔

اسے حاصل کر نیوالے اسے ان جاگیرداروں اور وڈیروں کو وراثت میں نہیں دے گئے

۔ میں خود جاؤں گا حق نواز کے پاس بلکہ۔ جج ہی جاتا ہوں حویلی۔ خرکس جرم میں ہمارا پانی بند کیا گیا ہے، ہمیں ہماری فصلوں سے محروم کیا جا رہا ہے۔ اس نے سلگ کر ہاتھ میں پکڑی لالچی زمین پردے ماری۔

نہ نہ پٹ، نہ تو حویلی نہ جانا۔ خواہ مخواہ بڑے سائیں سے الجھ پڑے گا۔ امداد علی خوفزدہ ہو کر زمین سے کھڑا ہو گیا۔

الجھنے کی کیا بات ہے بابا۔ میں صرف مسئلہ ان کے سامنے رکھوں گا۔ ظاہر ہے جب چناؤ کا موقع سامنے آتا ہے تو یہ لوگ گوٹھ والوں کی حمایت ایسے ہی ہزار وعدے کر کے لیتے ہیں کہ اب کوئی بھوکا پیاسا نہیں رہے گا۔ ہر گھر میں چولہا جلے گا۔ چھوٹے بادگاروں کے تمام مسائل حل ہوں گے۔ اور جب وہ جاہل معصوم گوٹھ والوں کو بہکا کر اچھے عہدے حاصل کر لیتے ہیں تو پھر انہیں کیوں نہ ان کے وعدے یاد دلائے جائیں، خزان عہدوں کا اثر و رسوخ صرف اپنے لئے ہی کیوں۔ ہمارے لئے کیوں استعمال نہیں ہو سکتا۔ وہ سرخ چہرہ لیے پلٹ گیا۔ امداد علی اسے پکارتا ہی رہ گیا پھر اپنی پکڑی اتار کر ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گیا۔

بابا فقیر محمد اس چھوکرے کو سمجھاؤ۔ یہ تو چریا ہو رہا ہے۔ اس کی یہ باتیں مجھے بہت ڈراتی ہیں۔ بابا فقیر محمد اسے سمجھا۔

تو فکر نہ کر امداد علی۔ یہ چریا نہیں ہے۔ بابا یہ پڑھا لکھا چھوکرہ ہے۔ سرکاروں سے بات کرنے کا ڈھنگ جانتا ہے۔ ہو سکتا ہے رئیس اس کی بات سن کر کچھ ہم لوگوں کے اس مسئلے



پر غور کرے۔ فقیر محمد نے اسے بھی اور خود کو بھی خواب دکھایا۔

خدائے برتر، تیری زمین پر

یہ راہ بھولا ہوا قبیلہ کسی ٹھکانے کو ڈھونڈتا ہے، کوئی ٹھکانہ

جہاں حفاظت، سکون، راحت

متاع، محنت کا اجر، رنگ گل تمنا کی سبز خوشبو

مشام جاں کو بہار کر دے۔



امداد علی بیٹے کے ساتھ احتیاطاً خود بھی یا تھا۔ وہ اندر ہی اندر خوفزدہ تھا کہ جوان خون ہے۔ کوئی سخت بات منہ سے نہ نکل جائے جو ان بڑے کو خفا کر دے۔ یوں بھی وہ سجاوہ کی باتوں سے، وڈیروں کے خلاف زہرا لگتے جذبات سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان کا بیٹا اس گوشہ والوں کی بے بسی اور بے اختیاری سے نالاں ہے۔ اس کے خیال میں۔

دکھ کے یہ بوجھل شب و روز پ اپنے ہاتھوں نہیں کٹیں گے۔ ان گوشہ والوں کے لئے سکون کی منزل خود پ چل کر نہیں آئے گی۔ منزل کے لئے سفر کا شعور ضروری ہے۔

یہی شعور وہ گوشہ والوں میں پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اونچی اونچی حویلیوں کے گے سر کو جھکا

کر سوائے تذلیل کے، احساس ذلت کی گ اور بھوک کے، کچھ ہاتھ نہیں اے گا۔ وہ حویلیوں ہی کی طرف اگر دیکھتے رہیں گے تو عمر بھر بھکاریوں کی طرح ہاتھ باندھ کر ترستی ہوئی اشک بھری نظروں سے خود پر ظلم ہوتا ہوا دیکھتے رہیں گے۔

اب ضرورت ہے ظلم کے خلاف بغاوت کی، جائز حق کے وصول کی تگ و دو کی، جاہلیت کے خاتمہ اور علی الاطلاق بغاوت کی۔

یہ باتیں وہ ہر جگہ، ہر شخص سے کرتا تھا۔ جب بھی چھٹیوں میں گھر آتا اس کے دکھوں میں اضافہ ہو جاتا۔ اپنے لوگوں کی کم علمی اور بے بسی پر کٹ کر رہ جاتا اور اعلیٰ بیٹے کے اس جلنے کڑھنے پر خود افسردہ ہو جاتا۔ وہ بھی دوسرے ہاریوں کی طرح لاچار ہی تو تھا۔

پچل نے اپنے باپ اور سجاول کو حویلی میں داخل ہوتے دیکھا تو اس کا دل بری طرح دھڑکا۔ ہزار دسو سے اور خود دامن دل میں سمٹ اے۔ سجاول کے چہرے پر غیر معمولی پن دکھائی دے دہا تھا۔

یہ اڑکا صرف مہینہ بھر رہتا ہے مگر کتنا پریشان کرتا ہے۔ پچل نے دل میں سوچا۔ اوطاق کے دروازے پر پہنچ کر امد اعلیٰ نے ایک ملتی نظر سجاول کے چہرے پر ڈالی۔ پٹ بات نرمی سے کرنا، غصے میں نہ جانا۔ یہ رکیں لوگ ہیں۔ خفا ہو جائیں تو پھر بننا کام بگڑ جاتا ہے۔

ہونہہ کام بنتے ہی کب ہیں ہمارے۔ اس نے دل میں سوچا مگر باپ کو کوئی جواب ں ہیں

دیا۔ بس سرخ سرخ لب بھنج لئے پھر قدرے سلگ کر امد اعلیٰ کے دونوں ہاتھ جو سینے کے سامنے جڑے ہوئے تھے پکڑ کر نیچے کر دیئے۔

بابا سائیں ہم اپنے ہی جیسے انسانوں کے سامنے جا رہے ہیں۔ کوئی خدا کے سامنے تو نہیں جا رہے کہ ہاتھ باندھ کر اور سر جھکا کر اندر داخل ہوں۔ وہ پردہ اٹھا کر اندر داخل ہو گیا اپنے اسی اعتماد کے ساتھ جو اس کی شخصیت کا خاصہ تھا۔ جبکہ امد اعلیٰ دھڑکتے دل کے ساتھ اندر داخل ہوا تھا۔

و امد اعلیٰ کیسے ناہوا بابا۔ ابھی ابھی اوطاق سے وڈیرہ حق نواز کے مہمان اٹھ کر گئے تھے سو وہ وہیں تھا اور مہران شاہ بھی موجود تھا۔ اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سجاد کو ذرا چونک کر پھر بڑے غور سے دیکھا۔

سفید شلوار سوٹ میں اونچا لمبا، سرخ چہرے پر اعتماد لئے بھرپور سراپے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس میں کچھ غیر معمولی پن اسے بھی دکھائی دیا۔ بڑا مضبوط دکھائی دے رہا تھا وہ۔

سلام سرکار۔ امد اعلیٰ کے کانپتے ہاتھ مشینی انداز میں وڈیرہ حق نواز کے سامنے جاتے ہی جڑ گئے۔ وہ ایک کونے میں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

علیکم السلام اور سناؤ بابا سجاد کیسے ناہوا۔ سنا ہے بابا، شہر کے کسی کالج میں اپنی ذہانت کی بڑی دھوم مچا رکھی ہے تم نے۔ وڈیرہ حق نواز کے مونچھوں تلے لب مسکرائے تو اس نے بی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ یہ ستائش قبول کی۔ بیٹھو، بیٹھو بابا کیسے ناہوا۔ تمہاری پڑھائی وڑھائی



ختم ہو گئی ہے یا ابھی چھٹیوں پر ہی کئے ہو؟

جی چھٹیوں پر ہی یا ہوں، بس اب چند ماہ بعد تو مستقل جانا ہے۔ اس نے اپنے اسی اعتماد کے جواب دیا اور وڈیرہ حق نواز کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس کی یہ جرات مہراں شاہ کو دنگ کر گئی جبکہ امداد علی اندر ہی اندر اپنے سائیں کے چہرے کے بگڑے زاویے دیکھ کر سوکھ پتے کی طرح کانپنے لگا۔

کیوں بابا، گوٹھ میں جاؤ گے ہمیشہ کے لئے، تو شہر ویر میں نوکری و نوکری نہیں کرو گے؟ وڈیرہ حق نواز کے چہرے پر مکمل ٹھہراؤ اور سکوت تھا۔ یوں جیسے اسے سجاوہ کی اس حرکت پر کوئی شک نہ لگا ہو، یا پھر نظر انداز کر رہا ہو۔

جی نوکری تو ڈھونڈتے ہی ملے گی، مگر پہلے میرے کچھ اور ارادے ہیں۔

کیسے ارادے؟ مہراں شاہ نے چونک کر اس کی شکل دیکھی۔

کوئی خاص نہیں، فی الحال تو بابا اپنی زمین کا مسئلہ لے کرئے ہیں۔ اس کا اعتماد بلا کا تھا۔ مہراں شاہ کو جانے کیوں اپنی ہتک کا احساس ہوا۔

ایک باری کا بیٹا اور حویلی کے وڈیروں کے سامنے جس انداز سے بیٹھا اور گفتگو کر رہا تھا اسے سخت برا محسوس ہو رہا تھا۔ اپنی شان کے خلاف جیسے بڑی ہتک سے بغاوت کا علم بلند ہوا ہو۔ جیسے کوئی انقلابی کونسل سیم و تھور والی زمین سے پھوٹ نکلی ہو۔

امداد علی نے اپنا مسئلہ بتایا تو مہراں شاہ گویا گرم توے پر جا بیٹھا۔

یہ مسئلہ ڈرف تمہارے اکیلے کانہیں ہے اوگوٹھ کے اور بھی کئی لوگوں کا ہے۔ یہ حکومت کا کام ہے ہمارا نہیں۔

حکومت تک بات تو پ لوگ ہی پہنچا سکتے ہیں نا ذریعے تو پ ہی ہیں نا۔ اس لئے کہ اس گوٹھ سے نمائندگی حاصل کر کے وہاں تک پہنچنے والے پ لوگ ہی تو ہیں۔ سجاد نے غصہ ضبط کرتے ہوئے متانت سے کہا۔ ظاہر ہے گوٹھ والوں نے اسی لئے پ لوگوں کو چنا ہے کہ ان کے مسائل احسن طریقے سے حل ہو جائیں۔ جو کچھ کہا گیا تھا ان پر عمل بھی کیا جائے۔ خوب، تو تم ہمیں اب یہ بتانے کے ہو کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں؟ مہراں شاہ کی نکاحیں لال انگارہ ہو گئیں۔

جی۔ اس نے اسی اعتماد سے سر ہلادیا۔

ٹھیک ہے، ٹھیک ہے یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ مہراں شاہ کو اپنی جگہ سے اٹھنے اور کچھ بولنے سے پہلے وڈیرہ حق نواز نے ہاتھ اٹھا کر بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔ اس کے ٹھنڈے لہجے میں ملائمت نام کو نہ تھی بلکہ اجہیت تھی۔

میں ج ہی کچھ دی بھیج کر معلومات کروانا ہوں۔ تم سب لوگ اسے اپنے اپنے مسائل اسے بتادینا۔ مہراں شاہ کو اپنے باپ کا یہ انداز یہ اقرار کچھ پسند نہیں یا تھا۔ بس بابا یا کچھ اور۔ وڈیرہ حق نواز مسکرایا تو سجاد بے سنجیدگی سے اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ مسائل تو بہت ہیں۔ ایک ہی حل ہو جائے تو بہت ہے۔





گوٹھ والوں کے مسائل کا ذکر ہوگا، جہاں ان کی بہبود کی بات ہوگی وہاں یہ وڈیرے اپنا خول اتار کر اڑدھے کے روپ میں جائیں گے، مگر وہ ان گ اگلتے اڑدھوں کے خوف سے ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹائے گا یہ اسکا عزم تھا۔

اور وہ ایسی طاقت اور ایسا عزم ہر فرد کے سینے میں اتارنا چاہتا تھا، وہ حویلی سے باہر نکل گیا اس کے اوطاق سے نکلتے ہی وڈیرہ حق نواز نے ہنکارا بھرا اور کانپتے لرزتے امداد علی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ کسی لرزیدہ شاخ کی طرح جھول کر فرش پر بیٹھ گیا۔

سرکار جوان بچہ ہے، خون میں جوش رہتا ہے اسے معاف کر دیں سرکار۔ اس نے لرزتے سینے پر کانپتے ہاتھ باندھ کر التجا کی۔ مہراں شاہ کسی بھرے ہوئے شیر کی طرح اوطاق میں گھوم رہا تھا۔

تو اسے باندھ کر رکھا کرو امداد علی۔ وہ بھڑک کر گر جا۔

ہاں بابا امداد علی، ج تو غصہ پی گیا ہوں میں، پر سندہ۔

جی جی سرکار، میں اسے سمجھا دوں گا۔ وڈیرے کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی امداد علی

نے بیٹے کی زندگی کی بھیک مانگ لی۔

تم جیسے کم کمین بے اوقاتے اپنے خول میں سمٹ کر رہو اس میں عافیت ہے اسے یہ بھی

کہہ دینا کہ، اسے گوٹھ میں دوسرے یاں پڑھ لوگوں کو تعلیم سے شنا کرانے کا ٹھیکہ لینے کی کوئی

ضرورت نہیں ہے، کیا ہم مر گئے ہیں کس لئے، یہ اچی گدیاں سنبھال رکھی ہیں۔



جو اپنے رستے سے بیخبر ہوں

وہ کس طرح تیری راہ پوچھیں

خدائے برتر خدائے برتر

وہ سخت پڑا مردہ دل ہو رہا تھا۔ تنکے سے خشک زمین پر بے مقصد لکیریں کھینچتے ہوئے  
جانے اسے کتنی دیر ہو گئی۔

بابا کی اس کے جانے کے بعد کیا عزت افزائی ہوئی تھی اس نے یہ بات بابا کو دہلیز سے  
اندر تے ہوئے اور چار پائی سنبھالتے دیکھ کر محسوس کر لی تھی۔

بے شک بابا نے کچھ نہیں کہا تھا اس سے، مگر غم غم نکھوں میں اداسی اور کمتری کا ایسا جال  
پھیلا ہوا تھا جس نے اسے بری طرح کبیدہ خاطر کر دیا تھا۔

اسے لگا جیسے بابا اس کی زبان، اس کے ہاتھ باندھ رہے ہیں۔ اس کے ارادوں کو  
متزلزل کر رہے ہیں مگر اتنی جلدی محض ایک جھٹکے میں وہ اپنے کب کے باندھے ہوئے ارادوں  
کو کیسے توڑ دیتا۔

سوائے خدائے برتر کے کسی کے گے جھک جانا اس کی فطرت کے خلاف تھا، وہ ان  
ہزاروں بتوں کو ان معبودوں کو نہیں پوج سکتا تھا۔

سجاول ہٹ فقیر محمد یہاں سے گزرتا ہوٹھ کر رک گیا اس کے قریب چلا یا۔

اسے امداد علی کے ذریعے خبر مل گئی تھی کہ وڈیرے نے اس کی بات کو قابل اعتنا نہیں جانا



تھا۔ (یہ تو ہونا ہی تھا)

پٹ، تو دل چھوٹا نہ کرو، رابندی ہی سہی گزر ہو ہی جائے گی کل تین وقت کھاتے ہیں آج بھی تین وقت ہی سہی پر ذرا سوکھی کھالیں گے۔

بات دکھ کی یہ نہیں ہے چاچا۔ وہ زمین پر لکیریں کھینچنے کا سلسلہ ترک کر کے پتھر پر سے کھڑا ہو گیا۔

بات بے حیثیت، بے معنی ہو کر رہ جانے کی ہے، بے پر کے پرندے کی مانند زندہ رہنا کوئی زندگی ہے چاچا یہ محرومیاں برسوں سے چلی رہی ہیں، کہیں تو اس کا تدارک ہو۔ کوئی تو یہ ہنسی زنجیریں توڑے، کوئی تو گے بڑھے، مار کھا کر مارنے کا حوصلہ پیدا کرے۔

چل زیادہ پریشان نہ ہو، چل اٹھ چل تیرا وہاں انتظار کر رہا ہے، کہہ رہا تھا چاچا سجاوِل کو بھیج دینا۔

پٹ جا، تو چند ہفتوں کے لئے مہمان بن کر آتا ہے اور اتنا رنج و آتا جو جھ لے کر واپس جاتا ہے۔ فقیر محمد نے اس کا مضبوط شانہ تھپکا تو وہ مبہم سے انداز میں مسکرا کر گے بڑھ گیا اونچا لمبا قد، چوڑے شانے بھر پور مردانہ چال فقیر محمد اسے دور تک دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں سراہ کر ماشاء اللہ کہہ کر اپنے رستے پر چل پڑا۔

سجاوِل کے رستے میں حویلی کی جیب اچانک رکی تو وہ بھی ٹھہر کر رک گیا۔

غلام محمد ذرا نیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا اور بکیر واپنی مالکن کے حکم سے رکی تھی۔ ہتھی سے  
پچھلی چرف کاریشی جالی پردہ اٹھا اور عابدہ حق نواز کا چہرہ دکھائی دیا۔ ایک شوق کا جہاں خود بخود  
دل میں سمٹ یا تھا فوراً ہی معمول پر گیا۔

السلام علیکم اس نے احتراماً مسکرا کر سلام کیا۔

وسلام کیسے ہو۔ عابدہ زرا سا مسکرائیں اس نے بھی نکھوں کو جنبش دے کر شانے اچکا  
دیئے۔ ٹھیک ہوں۔

بڑے دن ہو گئے، ہلتھس حویلی کی طرف نہیں ئی زیمیل بہت یاد کرتی ہے اسے عابدہ  
حق نواز کے چہرے پر ملائمت اور اپنائیت تھی۔

زیمیل کے نام پر احساسات ذرا سے منتشر ہوئے جیسے ساکن جھیل پر چھوٹا سا کنگر گرا ہو۔  
پتا نہیں، مجھے تو نہیں پتا میں سمجھوں گا۔

اداسجاول حویلی کے اندر بڑی گھٹن بڑا جس رہتا ہے اندر رہنے والوں کے لئے کوئی راستہ  
کوئی دریچہ نہیں ہے، جو کھلی فضا، زاد ہوا میں کھلتا ہو، نہ گرمادینے والی گرمی کا راستہ ہے نہ بخ  
بستہ کر دینے والی ٹھنڈی ہواؤں کا، اور یہ چری زیمیل کچھ اور ہی ہو چ رہی ہے وہ نا سمجھ ہے، پر  
دل کب سمجھداری کا ساتھ دیتا ہے وہ تمہیں منزل سمجھنے لگی ہے اپنی نجات کا ذریعہ، یہ جانتے  
ہوئے بھی کہ، راستہ کوئی نہیں ہے اور منزل ڈھونڈنے میں بھی ہے، ہے ناں پاگل۔ عابدہ حق نواز  
نے رسائیت سے کہا۔





پر گئیں۔

سوچنا کیا ہے، بڑے دن ہو گئے ہیں بلقیس بھی ئی نہیں ہے جاتی تو کچھ دل بہل جاتا ہے۔ وہ کرسی سے اٹھ کر بیڈ پر بیٹھی۔

میرے ساتھ چلتیں تم چاچی کی طرف۔ ادی عابدہ نے غور سے اس کی شکل دیکھی پھر سر جھکا کر ہاتھوں سے موٹے موٹے کھنکھتے کڑے اتارنے لگیں۔

ادی یہ تم کیوں اتار کر رکھ دیتی ہو پہنے رہونا۔ انہوں نے اپنی مخصوص سنجیدگی سے کہتے ہوئے بیڈ سے اتر کر لا پرواہی سے کڑے سنگھار میز کے خانے میں ڈال دیئے۔

سجاول کو کہا تھا میں نے، کہ بلقیس کو بھیجنا حویلی۔ وہ اپنا سادہ سا سوٹ نکالتے ہوئے ذرا سارخ موڑ کر اس کا چہرہ دیکھنے لگیں جس پر ایک رنگ سا کر ٹھہر گیا تھا۔

سجاول۔۔۔۔۔ وہ پ کو کہاں ملا ادی۔ اس نے سر اٹھایا مگر پھر دوسرے لمحے نظریں چرائیں۔

راستے میں کہیں جا رہا تھا، میں نے گاڑی روک کر بات کر لی چل تو بہن کے معاملے میں بڑا سخت ہے۔

گلتا ہے حویلی کے مالکوں کے ساتھ رہ کر ان جیسا ہی ہو گیا ہے۔ عابدہ کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تھی۔ زویل نے جھکی جھکی پلکوں سے نظر بھر کر دیکھا اور ہاتھ روم کی طرف بڑھ گئی۔

شام کو بلقیس تی تو وہ کھل انھی پھر دونوں باغیچے کے مخصوص گوشے میں بیٹھ کر باتیں

کرنے لگیں۔

ارے ہاں تیرے اس رشتے کا کیا ہوا؟

زیمل کو اچانک یاد گیا۔ بلقیس بری طرح شرمائی۔

بات پکی ہو گئی ہے اس لئے تو تے ہوئے شرم رہی تھی۔ اس نے یہ کہتے ہوئے

دوپٹے میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ زیمل مارے خوشی کے اسے دیکھے گئی پھر اس کا دوپٹہ کھینچ لیا اور دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنس پڑیں۔

اتنی خوشی کی خبر ہے اب مٹھائی تو کھلاؤ گی نا

ایسے نہیں، تم گھر کر کھانا۔ بلقیس نے کہا تو وہ ایک لمحے چپ سی رہ گئی۔

کتنے عرصے سے وہ بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ بلقیس کے گھر جانے کا اور جیسے اچانک اس کا

روان روان کھل اٹھا۔

ہاں ضرور۔

سچ بلقیس پہلے حیران ہوئی پھر خوشی سے بولی، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

پتا ہے کیا، ادا سجاو ل اس دن کہہ رہا تھا۔ وڈیری زیمل تو پاگل لگتی ہے۔

کیا۔۔۔۔۔ سجاو ل نے کہا۔ اس کا دل سینے میں دھک دھک کرنے لگا لمبی پلکیں

لرز کر رہ گئیں۔

بلقیس سادگی سے کہہ رہی تھی۔ میں اس سے لڑ پڑی، میں نے کہا لو اس نے بھلا کیا

پاگلوں والی حرکت کی ہے پاگل ایسے ہوتے ہیں، تو۔۔۔۔۔ بولا ایسے ہی تو ہوتے ہیں۔

زیمیل جھٹ اپنی جگہ سے کھڑی ہو گئی۔ اسے لگا جیسے بلیس نے یہ باتیں کہ کر دل کے ساز پر مضرب مار دیا ہو جس سے ہر تار جھنجھٹا اٹھا ہو۔ کوئی انوکھا گیٹ چھڑ گیا ہو۔  
اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

(جذبوں کو چھپا چھپا کر جینا بھی کتنا مشکل کام ہے، احساسات پر بند باندھنا ہزار طوفانوں کی موجودگی میں اور بھی مشکل۔)

بلیس، میں واقعی پاگل ہوں۔ اس نے میرا پاگل پن دیکھا ہوگا تب ہی کہانا پتلے پتلے ہونٹوں کے درمیان بڑی پیاری مسکراہٹ تھی۔ جس کا مفہوم بلیس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔

اونہہ، چھوڑ دو وہ تو یوں ہی چھیڑ رہا تھا تم کوئی پاگل تھوڑی ہو۔ اسے بلیس کی اس وضاحت اور تسلی کی ضرورت کہاں تھی۔ اس کا دل تو انوکھی لے پر دھڑکے جا رہا تھا۔  
یہ انکشاف جیسے اسے بڑا ہی خوبصورت محسوس ہوا تھا وہ بے مقصد مسکراتی رہی۔

اماں کی خوب منتیں کر کے بلیس کے گھر جانے کی اجازت حاصل کی اس میں زیادہ ہاتھ زینت کا تھا جو تیسری اور فی الحال چیتتی بیوی تھی، وڈیرہ حق نواز کے سامنے اس معاملے میں اس کی چل بھی گئی۔

زیمیل تو کھل اٹھی۔ مگر جانے کیوں بڑی اماں کا چہرہ سمجھ گیا۔ شاید اندر کہیں اپنی ذات



کے بے معنی ہونے کا دکھ امنڈا اور پھر اندر ہی کہیں گم ہو گیا تھا۔

وہ بھاگل کے ساتھ ٹی تھی مگر بھاگل کو اس نے بلقیس کے گھر کے باہر ہی سے واپس جو لی بھیج دیا یہ کہہ کر کہ چل کو کہہ دینا وہ ایک گھنٹہ بعد مجھے گاڑی میں کر لے جائے۔

دروازہ سجاد نے کھولا تو اسے دیکھ کر دیواروں کی مانند گنگ رہ گیا۔ سیاہ دھماکے اور شیشوں کے کام والی بڑی سی چادر میں وہ پر نور مسکراتے معصوم چہرہ کے ساتھ بے حد نزدیک تھی۔

دوسری طرف بھی کچھ ایسا ہی حیرت کا عالم تھا۔ مگر یہ عالم مدہوشی شرم و حیا کے باعث لمحہ بھر ہی رہا دوسرے لمحے چوڑیاں چھٹکیں تو وہ ہوش میں کر جلدی سے پلٹ کر اندر چلا گیا بلقیس اسے دیکھ کر سبزی کاٹتے چھوڑ کر بھاگ کر گئی۔

ہائے اماں دیکھ تو زبیل و ڈیری ٹی ہے ہمارے گھر۔

یہ کیا دیوانگی ہے بلقیس اس نے اندر بلقیس کے ساتھ قدم رکھا تو دیوار کے پاس سے اس کی بھاری ناگواری سے بھری وازا بھری۔

کوئی اتنی اہم شخصیت تو نہیں گئی گھر میں، کہ اتنی خوش ہو رہی ہے وہ بھی انسان ہی ہیں تمہارے میرے جیسی۔ وہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ مگر لفظوں کے نشتر اور لہجے کی کاٹ زبیل حق نواز کی پور پور میں اتر گئی۔ اس کا چہرہ احساس تذلیل سے لال ہو گیا۔ بلقیس الگ اپنی جگہ خفیف سی ہو گئی اسے یقین نہیں تھا کہ اس کا بھائی یہ رویہ اختیار کرے گا۔

چار کتابیں پڑھ کر اس کا دماغ خراب ہو گیا ہے ادا کا تو بلیقیس، دھیرے سے بڑبڑائی پھر  
دروازے سے دو چار قدم اندر ہی ساکت ہو جانے والی زیمیل کا ہاتھ تھام کر بولی۔  
تم برا نہ ماننا دی یہ تو۔

نہیں برا تو ان باتوں کا مانا جاتا ہے بلیقیس جو غلط ہوں، اس نے کچھ غلط تو نہیں کہا۔  
ہے وہ خود کو سنبھال چکی تھی اور خوش دلی سے ہنس دی۔

بے شک اس کا رویہ ناشائستہ تھا اور لہجہ تلخ، اس سے قطع نظر اس کی بہ باتیں یہ نظریات  
اسے پسند تھی عاجزی سے جھکنے والے، سینے پر ہاتھ باندھ کر منمنانے والے انسان اسے کب  
اچھے لگتے تھے اس کے چہرے پر خفگی کا کوئی تاثر نہ دیکھ کر بلیقیس کو تسلی ہوئی وہ اسے لئے اپنے  
کمرے میں چلی گئی۔

اماں گوٹھ کے وڈیرے کی بیٹی کو اپنے نگن میں دیکھ کر بدحواس سی ہو کر چارپائی بچھانے  
لگیں۔

بسم اللہ، بسم اللہ، ج تو ہمارا نگن چمک گیا ڈو۔ انہوں نے جلدی میں چارپائی پر  
اپنی اوڑھنی ہی بچھا دی۔

سیدھے سادے معصوم لوگوں کا اپنائیت بھرا یہ انداز اس کا دل گداز کر گیا۔ وہ بجائے  
چارپائی پر بیٹھنے کے اماں کے قریب ٹی ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

میں بھی بلیقیس کی طرح ہی ہوں، مجھ سے غیریت نہ برتیے۔ اس کی واز بھاری ہو گئی

پھر وہ زور سے ہنس دی۔

میں تو بلیس کی بات سنی ہوئی ہوں۔

ہاں، ہاں کیوں نہیں۔ اماں اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر چائے پانی کا انتظام کرنے کمرے سے چلی گئیں وہ اور بلیس ایک چار پائی پر بیٹھ کر بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں۔ مگر اس بے تکلفی میں بلیس کے انداز میں ایک احتیاط تھی ایک احترام تھا کہ بہر حال وہ ایک وڈیری تھی۔ سجاو، حویلی کے اندر بڑی گھٹن، بڑا جس ہے، اندر رہنے والوں کے لیے کوئی در، کوئی در پہ کھلی فضا میں نہیں کھلتا۔ عابدہ حق نواز کے جملوں کی بازگشت سجاو کے ذہن میں ابھری۔ وہاں بھی وہ عجیب سے احساس کا شکار ہو رہا تھا۔

بلیس کی کسی بات پر وہ زور سے ہنسی تھی۔ کھلے کھلے شفاف چہرے پر ہنسی کی یہ چاندی بچہ بھلی معلوم ہو رہی تھی اتنی کھلتی اور زاد ہنسی تھی۔ سجاو سومرو کے پورے وجود میں ایک سرمستی سی دوڑ گئی۔ وہ اچانک صحن میں چلا یا اسے دیکھ کر اس کی ہنسی یوں بند ہو گئی جیسے روشنی کے بشار کے سامنے کسی نے دیوار کھڑی کر دی ہو، جسے نغمہ ساز کا گلا گھونٹ دیا گیا ہو۔

اس کے نازک ہونٹ پس میں جڑ گئے اور نظریں سجاو کے نکھرے وجود سے ہو کر جھک گئیں جب کہ بلیس اس کی موجودگی سے بیخبر کہہ رہی تھی۔

تم نے ادا سجاو کی باتوں کا برا تو نہیں مانا تھا نا، پتا نہیں اسے حویلی سے کیا پر خاش ہے۔ بہت خفا رہتا ہے وہ رئیس لوگوں سے



بلیس اس کے دل کی غیر معمولی دھڑکن سے بھی بے نیاز تھی۔

شاید اسی لیے وہ تمہیں دیکھ کر یوں غصے میں گیا، ورنہ بھلا تم سے اس کی کیا دشمنی۔  
نہیں بلیس مجھے تو خوشی ہے کہ دشمنی کا ہی سہی اس نے حویلی والوں سے کوئی رشتہ تو

جوڑا۔

وہ پلکیں جھپکا کر بیاختیار بول گئی۔ بلیس نے حیرت سے اس کی جھکی جھکی لرزتی پلکوں کی  
گھنی باڑھ کو دیکھا، پھر سجاو کی موجودگی محسوس کر کے پلٹی، اور جیسے بہت کچھ سمجھ گئی۔  
وڈے لوگوں سے دشمنی مول لے کر ہم چھوٹے لوگوں کا نقصان ہوتا ہے، قا اور غلام کا  
رشتہ کافی نہیں ہے کیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنستا ہوا ان دونوں کی طرف گیا بڑا طنز یہ لہجہ تھا۔

ہم سے مراد میں خود ہر گز نہیں ہوں، بلکہ یہ گوٹھ والے ہیں جن کو سیڑھی بنا کر ہی وہ اپنی  
انانیت کی تسکین کرتے ہیں اگر یہ سیڑھی ہٹ گئی تو، وہ بھی زمین پر ہوں گے، مگر۔۔۔۔۔ وہ  
لحہ بھر کر کا۔ چہرے پر پتھر یا پین سمٹ یا۔

مگر المیہ تو یہی ہے کہ گوٹھ والے اپنی ہی طاقت سے بیخبر ہیں اور میرا مقصد ان میں  
صرف اور صرف یہی شعور بیدار کرنا ہے، کہ قا اے وقت جنم لیتے ہیں جب انہیں کوئی قا  
کہنے والا اور سمجھنے والا ہو، کوئی پیدائشی غلام نہیں ہوتا نہ ہی کوئی پیدائشی قا ہوتا ہے، ہر شخص اپنی  
اپنی سوچوں کے مطابق خود کو اپنے رشتوں، سانچوں اور طبقوں میں ڈھال لیتا ہے۔

ادابلتیس نے کچھ کہنا چاہا کہ ذیل نے اسے روک دیا۔ اور اپنی جگہ سے ہٹ کر سجاد کے سامنے گئی۔

میں جانتی ہوں، تم یہ باتیں بابا سائیں کے سامنے بھی کہنے کی جرات رکھتے ہو مگر، خدا کے واسطے ان کے سامنے بھی نہ کہنا، ایک عمر سے قاکھلوانے والے اتنی جرات برداشت نہیں کر سکیں گے، اور کوئی بڑا نقصان تمہاری جھولی میں نہ گرے، میں نہیں چاہتی کہ تمہیں کوئی گزند۔۔۔۔۔ اس کی واز بھر گئی۔ دراز پلکیں لرز کر نکھوں پر یوں جھک گئیں جیسے کسی چشمے پر بید مجنوں کی شاخیں، سجاد دم سادھے حیرت اور بے یقینی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ ان لرزتی پلکوں کے سائے میں اس لہجے میں کیا کچھ نہ تھا۔

وہ کوئی سادہ لوح یا نو عمر بہر حال نہیں تھا کہ وہ رنگ نہ پہچانتا، محبت کی روشنی کو نہ پہچان پاتا جس میں دل کے ہفت رنگ جذبے یوں یکجا ہو جاتے ہیں جیسے سمان پر شفق رنگ بھر جاتے ہیں۔ اس کا دل سینے کی چار دیواری میں کسی انقلاب سے درچار ہونے لگا۔

خود کو مضبوط اور ناقابل تسخیر سمجھنے والا سجاد اس معصوم صورت سے تسخیر ہو گیا تھا۔ اسے لگاریمل حق نواز نے اس کے دل کے ساز پر ہاتھ رکھ دیا ہو، اور ایک خوبصورت موسیقی بچ اٹھی ہو۔ جس کے لے میں وہ خود کر بہتا ہوا محسوس کرنے لگا تھا۔

میں چلوں گی بلتیس۔ وہ نظریں اٹھانے سے گریز کر رہی تھی۔

سجاد سومرو کی۔۔۔۔۔ نکھوں میں کچھ ایسی گہرائی اور خوبصورتی ہو رہی تھی کہ ان میں

ڈوت جانے کا کھوجانے کا خوف ابھر رہا تھا۔

وہ ڈھلکتی چادر سر پر ڈال کر جانے کو پلٹی۔ مگر دوسرے لمحے اس کی چوڑیوں سے بھی نرم و نازک کلائی اس کی مضبوط ہتھیلی میں تھی۔

بات سنو۔ جہاں اس کا دل زور سے ڈھڑکا، وہیں بلقیس نکمھیں پھاڑے اپنے ادا کی اس جرات پر حیران و پریشان نظر نے لگی۔ اور پھر گھبرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ زویل کا چہرہ اس کی قربت کی پیش سے گرم ہو رہا تھا۔

زویل حق نواز اوپر سے نیچے اترنا جتنا سان دیکھائی دیتا ہے، نیچے سے اوپر چڑھنا اتنا ہی مشکل، تم مجھ تک تو سکتی ہو، مگر میرا اوپر چڑھنا ناممکن ہے۔

حیرت ہے، میں تو تمہیں بہت بہادر اور دلیر سمجھ رہی تھی۔ وہ ہنسکی سے اس کی گرفت سے کلائی چھڑا کر دل کو سنبھالتے ہوئے ہولے سے ہنسی۔ اس کا لہجہ ٹوٹا ہوا اور استہزاء سیہ تھا سجادول ہونٹ بھیج کر چند ٹاپے اسے دیکھتا رہا۔

وہ دونوں اس لمحے اس بات سے بے نیاز تھے کہ یہاں حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن بلقیس بھی کھڑی ہے۔

جب حویلی کی ایک نازک لڑکی اتنی جرات مند ہو سکتی ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ۔۔۔۔۔ سجادول علی شاہ بزدل ہو مگر۔۔۔۔۔ وہ ایک قدم اس کی جانب بڑھا اس کی سمت ذرا سا جھکا، اور اس کی کھلی کھلی سمندر صفت آنکھوں میں جھانکتا ہوا بولا۔



یہ یقین بھی تو ہو، کہ پھر وہ خالی ہاتھ نہیں رہے گا صرف تشنگی اس کے حوصے میں نہیں گی۔  
اس کے لہجے میں مہکتے جذبوں کی کھینچتا تھی وہ جذبے جو ذیل حق نواز کی رگوں میں اتر  
کر خون میں گردش کرنے لگے تھے۔

اس نے ذرا سی پلکیں اوپر اٹھائیں پھر رج موڑ لیا۔ یہ کوئی سودا تو نہیں ہے سجاوہ علی شاہ،  
منزل کا یقین تو مسافت طے کرنے کے بعد ہی ملے گا وہ رکی نہیں اور سرعت سے باہر نکل گئی  
جہاں گاڑی اس کی منتظر تھی۔

ہاں ذیل حق نواز، منزل کبھی خود چل کر نہیں تی اس کے لیے سفر ضروری نہیں ہے۔ اس  
کے لبوں کی تراش میں دلفریب مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ پلٹا مگر بلقیس پر نگاہ پڑی تو جھل سا ہو کر رہ  
گیا۔

دیکھاناں میں نے کہا تھا نا، تیری وڈیری، بالکل پاگل ہے۔  
ہاں ادا تم بالکل ٹھیک کہتے ہو، وہ واقعی پاگل ہے۔ بلقیس دھیرے سے بڑبڑائی اور بڑے  
بڑے قدموں سے باہر کی طرف جاتے سجاوہ کو خوشی، خوف اور حیرت کے ملے جلے احساسات  
کے ساتھ دیکھتی رہ گئی۔ اس انکشاف نے جہاں اسے حیران کیا تھا مسرت سے گدگدایا بھی تھا  
وہیں خوف کا ناگ بھی سراٹھا کر پھنکارنے لگا تھا۔

یہ جوڑ، کیا ممکن ہو سکتا ہے وہ دونوں اس راہ میں قدم رکھ کر سودو زیاں سے یکسر بیپناز ہو  
چکے تھے مگر۔۔۔۔۔ بلقیس ساری رات کروٹ پر کروٹ بدل کر اچھے اور برے خیالات میں

جکڑی رہی۔

میں تیرے سنگ کیسے چلوں بجنا  
تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا  
تو بہاروں کی خوشبو گھٹی چھاؤں ہے، میں ستارا تیرا  
زندگی کی ضمانت تیرا نام ہے، تو سہارا میرا  
میں نے ساری خدائی میں تجھ کو چنا  
تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا  
تم چلو تو ستارے بھی جلنے لگے، نسوؤں کی طرح  
خواب ہی خواب نکھوں میں جلنے لگے رزق کی طرح  
تیری منزل بنے میرا ہر راستہ

وہ بال بکھرائے انہیں دیرے دیرے سلجھاتی پھر بگاڑ دیتی پھر سلجھانے لگتی، ساتھ ساتھ  
گنگنا بھی رہی تھی۔ ادی عابدہ، دروازے کی چوکھٹ پکڑے خاصی دیر سے اسے  
دیکھ رہی تھیں۔ پھر اندر اس کے پاس گئیں۔

کیا بات ہے، ج بہت خوش دکھائی دے رہی ہو۔ انہوں نے اس کے سراپے پر ایک  
نگاہ ڈالی۔

ہوں وہ پلٹ کر مسکرائی پھر برش سنگھار میز پر رکھ کر بالوں کو پیچھے جھٹک کر درتے سے

باہر جھانکنے لگی۔

وہی لان تھا، وہی فضا تھی، وہی رنگ تھا۔ سامن کا، مگر اسے ہر شے میں ج نفسگی اور تازگی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ دریچے سے لگ کر مسکراتے لگی۔

خوشی کا احساس تو دل کی زمین سے پوٹتا ہے ادی زمین دل شاداب اور سیراب ہو تو پھر وہاں سے خوشیوں کی کونپلیں ہی پھوٹی ہیں۔

عابدہ دم سادھے اس کی پشت پر بکھرے بالوں کے لچھوں کو تکتی رہ گئیں جو ہوا کے تھپڑوں سے اٹکیلیاں کرتے وہ بھی مسرور دکھائی دے رہے تھے۔

زیمل کو کیسی خوشی مل گئی اس بند اور جس زندہ حویلی میں کہ۔۔۔۔۔ اس کا لہجہ بھی مہک رہا ہے۔ اچانک ان کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ انہیں اس کی خوشی کا جواز فوراً ہی سوجھ گیا۔

سجاول سے تیری ملاقات ہوئی ہے کیا۔ وہ دھیرے سے پوچھنے لگی اس کا دل دھک سے رہ گیا اس نے پلٹنا چاہا مگر پلٹ نہ سکی۔ عابدہ کا شفیق ہاتھ شانے پر یا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ کہیں یہ خوشی عارضی نہ ہو زبے، یہ رنگ کچے نہ ہوں اب تو خوف۔۔۔۔۔ مجھے خوشی کی لہر سے بھی کہ کہیں یہ بھی ڈبو ہی نہ دے۔ وہ جھٹکے سے پلٹی۔ ادی عابدہ اسے بہت محبت سے دیکھ رہی تھیں۔ مگر نکھوں میں تشویش جھلک رہی تھی۔ وہ بے اختیار ان کے مہربان شانے پر جھک گئی۔

تجھے کیسے خبر ہوئی ادی کہ میری خوشیوں کا راستہ سجاول کی طرف جاتا ہے۔ اس کے لہجے



میں حیرت بھی تھی اور شرم بھی، عابدہ ہولے سے ہنس دیں اور درپے کا پردہ پورا کھولنے لگیں  
بس خبر ہو گئی انہوں نے باہر پھیلے اندھیرے میں نگاہیں گاڑ دیں۔

(میں محبت کے لمس سے نا شناس رہی ہوں تو کیا ہوا، محبت کے رنگ تو جانتی ہوں، اس  
خوشبو کو پایا نہیں تو کیا ہوا، پہچان تو ہے۔ ہنسنا بھول گئی ہوں پر، ہنسی کے سارے سر جانتی تو  
ہوں۔)

ارے واہ ایسے کیسے خبر ہو گئی۔ وہ سر اٹھا کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی۔

تیرے تو انگ انگ سے پتا چلتا ہے، بے وقوف کیا جانتی نہیں میں کہ بلقیس سے ملنے،  
اس کے گھر جانے کے کو تو اتنی بیتاب کیوں ہوتی ہے، اور اب بلقیس کی سگائی میں جانے کیلئے  
زینت اماں کی اتنی منتیں کر رہی ہے کہ بابا سائیں تجھے بھیج دیں۔ عابدہ ہنس کر اس کی نکھوں  
میں جھانکتے ہوئے بولیں تو وہ شرما کر ان سے دور ہٹ گئی اور بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔

وہ بہت سٹھا ہے ادی تم ملو گی، اسے دیکھو گی، اس کی باتیں سنو گی تو تمہیں بھی اس سے۔

۔۔۔ میں سچ کہتی ہوں ادی۔

ہاں بڑا کڑیل لڑکا ہے مگر، مگر میں ڈرتی ہوں، یہ سب جس طرح تم یا میں سوچ سکتے ہیں  
کیا، ایسا ہونا ممکن ہے۔ عابدہ اس کے چہرے پر پھیلے رنگ اور نکھوں میں چھائے سجاوے کے  
عکس کو دیکھ کر خوفزدہ ہو رہی تھیں۔

میں کچھ نہیں جانتی ادی، بس مجھے یوں لگتا ہے میرے حصے کی ساری خوشیاں سجاوے کی

منٹھی میں ہیں۔

مگر تیری تقدیر بابا سائیں کی منٹھی میں ہے عابدہ حق نواز کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ بکھر کر ٹوٹ گئی وہ الماری سے اپنا جوڑا نکالنے لگیں پھر کچھ سوچ کر پلٹ کر بولیں۔

وہ کیا کہتا ہے کیا اس میں اتنی جرات ہے کہ وہ اس حویلی میں، تیری تقدیر میں انقلاب لاسکے گا۔

زیمیل نے انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بہن کا چہرہ دیکھا خود بخود دھیمی مسکراہٹ لبوں کی تراش میں سمٹ گئی۔ بھلا سجادول سومرو کی دلیری اس کی جرات سے کون واقف نہیں تھا مگر اسے یوں بیجا بانہ اس کی تعریف کرتے ہوئے اس کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے ادی سے شرم نے لگی۔

اگر وہ دلیری اور جرات مند ہے، تب بھی کیا وہ تقدیر سے لڑ سکے گا۔ عابدہ حق نواز کے دل پر اداسی اور مایوسی کا دل شکن اندھیرا گہرا ہو گیا۔ انہیں زیمیل کی یہ خوشی پانی کے بلبلے کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔

تم وڈی بزدل ہوادی۔ وہ مسکرا کر ان کے نزدیک چلی گئی جہاں بابا سائیں سے خوفزدہ رہیں، وہیں اپنی تقدیر سے بھی ناامید رہیں۔ ہم کیسے سوچ سکتے ہیں کہ ہماری تقدیریں اللہ نے ہمارے باپ بھائیوں کے ہاتھوں میں تھما دی ہیں، انہیں ادی، تمہیں تمہارا گمان لے ڈوبا مگر میں؟؟؟ گمان نہیں ہوں، کہتے ہیں اللہ ہمارے گمان کے ساتھ ہے، بیشک بہت جرات مند بھی

تقدیروں کے دھارے نہیں موڑ سکتا، مگر یہ بھی تو کہتے ہیں نہ کہ تقدیر ہمیشہ بہادروں کا ساتھ دیتی ہے۔

اور سچ تو یہ ہے ادی کہ محبت ان تمام باتوں سے الگ ہے یہ پوں پ گھنگھور بادل کی مانند زمین دل پر برس جاتی ہے میں بھی جل تھل ہو گئی ہوں، مجھے اب نہ بہہ جانے کا خوف ہے، نہ ساحل کی تمنا وہ جذبوں سے پر واز میں بولی  
عابدہ حق نواز جذبوں کی شدت سے پاگل لڑکی کو دیکھتی رہ گئی۔

تو کیا وہ اس راستے پر پہنچ چکی ہے جہاں سفاک حقیقت چھپ جاتی ہے اور خوش گمانیوں کی چادر تن جاتی ہے جہاں امیدوں کا جہاں باد ہو جاتا ہے اور سب کچھ پالینے کی خواہش یا پار لگا دیتی ہے یا ڈبو دیتی ہے۔

خدا نہ کرے کہ میری ذیل غم کے سمندر میں ڈوب جائے۔ ان کارواں رواں ریل کے لیے دعا گو ہو گیا۔

پٹن	منجھو	چلڑو	پاٹی	مہ
کینٹن	پیو	چلڑو	پاٹی	مہ

بلیس کی ماما اور چاچا کی بیٹیاں بڑی خوبصورت لڑی ڈالے ہوئے تھیں۔ ج بلیس کی منگنی تھی وہ کڑھائی اور شیشوں سے جگمگ کرتے اور بڑے سے دوپٹے میں جھلملاتے زیورات کے ہمراہ بڑی پیاری لگ رہی تھیں۔



ماسی سکیئہ اور امداد علی کے چھوٹے سے گھر میں ج خوب رونقیں تھیں۔ زمیل حق نواز کے لیے یہ کھلکھلاہٹیں یہ رونقیں بڑی دلچسپی لیے ہوئے تھیں۔ وہ بابا سائیں کی خوب منتیں کر کے اور چھوٹے رئیس سلطان شاہ کی حمایت پر بلقیس کے گھر کی تھی۔ اب لمحے لمحے سے خوشی کشید کر رہی تھی۔

وہ اپنے دامن دل میں انول یادوں کا اضافہ کرنا چاہتی تھی۔ اسے یہ خوش سند لمحے بھلا حویلی میں کہاں ملنے تھے۔

بہت تھک گئی ہو کیا وہ جھوم سے نکل کر جب ایک خالی کمرے میں پڑی چار پائی پر لیٹی تو بلقیس اس کے پاس چلی آئی۔

وہ ابھی تک ان ہی کپڑوں میں تھی رسم ہو چکی تھی۔ ٹیلیہ (چاند کا نشان اس کا مطلب ہوتا ہے کہ اس لڑکی کا رشتہ کسی سے طے ہو گیا ہے) اس کی صبح پیشانی پر پھنوس کے درمیان چمک رہا تھا۔

بھلا خوشیوں سے جھولی بھرتے ہوئے بھی کوئی تھکتا ہے۔ وہ ہنس دی۔

لاں تمہاری باتیں تم میرے سر سے گزر جاتی ہیں، تم نے کھانا بھی نہیں کھایا میں ابھی لے کر آتی ہوں۔ بلقیس نے اپنا جگمگاتا گاج (دوپٹہ) اتار کر مسہری پر رکھا اور سادی چادر اٹھا کر اوڑھ لی تم رام سے بیٹھو کھانا وانا بھی کھا لوں گی، دہن یہاں وہاں چمک پھیریاں کھائے گی، سسرال والے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے کہ ہماری دہن تو پے میں نہیں نے مارے خوش

کے

کوئی نہیں، وہ بھلا کہنے والے کون ہیں، ویسے وہ جا بھی چکے ہیں۔ بلقیس ہنستی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ وہ مسہری پر بیٹھی رہی پر تھکن اور ایک طرح کی سرشاری سے اس کی نگاہیں از خود بند ہو رہی تھیں۔ اس چھوٹے سے گھر میں بیا رام چار پائی پر کتنا سکون مل رہا تھا۔

اس نے کھڑکی سے تی روشنی سے بچنے کے لیے منہ پر از خود چادر ڈال لی اور بلقیس اور اس کے گھر کے لوگوں کے بارے میں سوچنے لگی۔

اوئے بلی، تے ہی پڑ کر سو گئی۔ کسی نے روز سے اس کے منہ سے چادر نما دو پٹہ کھینچ لیا۔ وہ ہڑبڑ کر اٹھ بیٹھی یہ غیر اخلاقی حرکت کرنے والا سجاد ل تھا۔ وہ بھی بلقیس کے بجائے زیمیل حق نواز کو یوں اپنے کمرے میں اپنی مسہری پر سوتا دیکھ کر شپٹا گیا۔

اوہ، سوری میں سمجھا بلقیس ہوگی۔ وہ مسہری سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا مگر نظریں باوجود کوشش کے نہ پھیر سکا۔ وہ پیرٹ گرین کڑاھی والے کرتے اور کڑھائی کے ہم رنگ میں بڑی نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔ چمکتی جھیلوں جیسی نکھوں اور مہکتے رخساروں پر سبز رنگ ایک بہار دکھا رہا تھا ج پہلی بار اپنے دراز بالوں کر چوٹی کی بجائے سبز رومال سے جکڑ رکھا تھا۔ کانوں میں چھوٹی چھوٹی جھمکیاں لٹک رہی تھیں۔ جو کھڑکی سے تی روشنی میں جگر جگر کرتیں چہرے پر نکھار لارہی تھیں۔

سجاول سومرو کر لگا جیسے اس کا پورا اکمرہ مہک اٹھا ہو۔ موسم نے یہیں ڈیرہ ڈال لیا ہو۔

سوری تم مجھے کہنا چاہئے کہ بن پوچھے تمہارے کمرے میں ڈیرہ ڈال لیا ہے وہ اب بظاہر خود کو سنبھال چکی تھی۔ مگر دل کو اب تک نہ سنبھال پائی تھی۔ جو پاگل ہو رہا تھا۔

بن پوچھے دل میں بھی تو ڈیرہ جما لیا ہے، اس پر معذرت نہیں کرو گی، پوری خالی زمین پر قبضہ کیا ہے۔ سجاول نے یہ کہتے ہوئے اس کی شرم سے اٹھتی گرتی پلکوں کا کھیل بید دلچسپی سے دیکھا۔ اس کے عارض کو یوں یکدم دھکتے دیکھنا اس کے لیے بڑا دلچسپ تجربہ تھا دل کو گدگانے والا جذبول میں ہیجان پیدا کرنے والا، مگر وہ بید مضبوط اعصاب کا تھا کوئی سطحی حرکت کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

سجاول علی شاہ حساب تو تم نے بھی پورا لے لیا۔

وہ مسہری سے اٹھ کر ذرا سانس نہی پھر دوپٹہ سر پر ڈال لیا اس طرح کہ اس کا سرخ دیکتا جذبول سے پر چہرہ دھا چھپ گیا۔

ارے بیٹھو نا دیکھا میرا کمرہ وہ راہ میں کی کرسی ایک طرف ہٹا کر کمرے پر طائرانہ نگاہ دوڑاتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔

بس یہی ہے میرا دولت کدہ دیکھ لو اور اب بھی وقت ہے سوچ لو، وڈیری حق نواز کہ

سمان سے اتر کر زمین پر ناپڑے گا، تمہارے لیے یہ سراسر خسارے کا سودا ہے۔ اس کا لہجہ بڑا

سنجیدہ اور لیے دیئے سا ہو گیا۔



زیمل نے چونک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کی پلکیں اس کے سراپے پر ٹھہر گئیں۔ سیاہ  
شلوار سوٹ میں وہ اونچا لمبا، چہرے کی خوبصورتی میں سنجیدگی سمیٹے، اسے اپنے دل میں اترتا  
محسوس ہو رہا تھا۔

اتنی بہت سی کتابیں پڑھ کر تم شاید لطیف جذبوں کو، چاہے جانے کے فخر کی دولت کو،  
فضول خیال کرنے لگے ہو، محبت کوئی کاروبار تو نہیں ہے سجادول شاہ اگر سودا بھی ہے تو دل کا،  
جس میں نہ خسار کا حساب لگایا جاتا ہے نہ منافع کا، اکناکس کا کوئی اصول نہیں ہے۔ اس  
کے لہجے میں دبا دبا احتجاج تھا ہلکی خفگی تھی سجادول نے اس کا دل ہی توڑ ڈالا تھا۔

کیا اب بھی وہ اس کے جذبوں کو حویلی کے بڑے سردار کی دہنی سوچ سے تول رہا تھا۔ یہ  
تو ایک جوان سال لڑکی کے نو خیز جذبے تھے۔ جو مثل مہتاب تھے اور بھلا ابھرتے مہتاب کا  
راستہ کون روک سکا ہے۔ یہ سجادول اسے نفع نقصان سے کیونکر ڈرانے کی کوشش کر رہا ہے۔

وہ جانے لگی تو اس نے بڑی نرمی سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ اپنی جانب  
کر لیا، اس نے پلکیں اوپر اٹھائیں وہ بڑی لگاوٹ اور جذبوں سے پر نظروں سے اسے دیکھ رہا  
تھا۔

خفا ہو گئیں

نہیں اس نے پلکوں کو منوں بوجھ کے ساتھ رخساروں پر جھکا لیا۔  
(پتا نہیں اس شخص کو کیسا ہنر تھا ہے خفا کر کے منالیتا ہے یا پھر اسے ہی خفا ہونا نہیں

تا) بہت اچھی لگ رہی ہو، یقین کرو، تمہیں یہاں دیکھ کر میرا دل بہت خوش ہے۔  
اس کے لپے میں کوئی جھوٹ، کوئی بناوٹ نہیں تھی وہ بے حد سادگی اور محبت ہے کہہ رہا تھا  
اس کے رخساروں پر لہو رنگ چھلک یا۔

محبوب کی اس تعریف نے اس کے دل میں پھول کھلا دیئے۔ اس نے خود بھی سینے میں  
اپنا سراپا دیکھا تھا اسے اچھا بھی لگا تھا ادوی عابدہ اور بلقیس نے بھی اس کی بہت تعریف کی تھی۔  
مگر سجادول کے منہ سے، اپنی تعریف سن کر اس کا دل اور طرح سے سرشار ہوا تھا۔ اسے پہلی بار  
معلوم ہوا تھا کہ محبوب کی ذرا کی تعریف ذرا سی توجہ دل میں کیسے کیسے پھول کھلا دیتی ہے کتنی  
خوشیاں بھر دیتی ہے۔ کیسے رنگ بھر دیتی ہے۔  
اچانک کھڑپڑ کی واڑ پر وہ سنبھل گئی۔

؟؟؟ نازیل وہ اسے دروازے کی جانب لپکتا دیکھ کر بے تابی سے پکار بیٹھا۔  
نہیں بہت دیر ہو جائے گی حویلی سے گاڑی بھی تی ہوگی بلکہ ادا سچل نے گاڑی تو شاید  
یہاں نہیں لا رکھی ہے، تم شہر کب جا رہے ہو وہ رک کر کچھ سوچ کر پوچھنے لگی۔  
کیوں کوئی فرمائش کرنی ہے وہ مسکرایا وہ بھی ہنس دی بڑی مطمئن ہنسی تھی۔  
اب کسی چیز کی تمنا ہی نہیں رہی، بن مانگے ہی سب کچھ مل گیا ہے۔ اس نے یہ کہتے  
ہوئے بلقیس کو تے دیکھا تو جھپا کے سے کمرے سے نکل گئی۔ سجادول مسکرا دیا۔ مگر دوسرے پل  
اس کی مسکراہٹ کو ہو گئی۔

سجدگی چہرے پر سمٹ ئی وہ مسہری پر بیٹھ گیا۔

پتا نہیں وہ زیمیل حق نواز کی ان مسکراہٹوں کو سدا بہار رکھ سکے گا یا نہیں، کہیں اس کے حوصلے کی چٹانیں چٹخ نہ جائیں۔ اس کے ذہن میں سوچوں کا ایک جہاں باد ہو گیا۔ وہ اٹھ کر ٹہلتا ہوا کھڑکی تک یا اور پردہ ہٹا کر باہر دیکھا تو زیمیل حق نواز پر نگاہ پڑی وہ حویلی کی مخصوص ہجیر و کے پاس کھڑی تھی۔ جس کو چلانے والا اس کا اپنا بھائی، وڈیرے کا ملازم بچل تھا۔ اس کے لبوں پر مجروح مسکراہٹ بکھر کر ٹوٹ گئی۔ وہ چاہتا تو زیمیل حق نواز کے ساتھ یہ مختصر سفر کا ساتھی خود ہوتا، مگر اسے یہ گوارہ نہیں تھا وہ اس کے ہمراہ پورے استحقاق کے ساتھ چلنا چاہتا تھا سر جھکا کر مؤدب ہو کر نہیں، چاہے وہ سفر ایسی کسی ہجیر و میں نہیں پیدل ہی سہی لیکن اس فخر کے ساتھ کہ زیمیل حق نواز اس کے ساتھ چل رہی ہے وہ وڈیری زیمیل کے ہمراہ نہیں۔

ادھر زیمیل نے ہجیر و میں بیٹھتے بیٹھتے الوداعی نگاہ اس کی کھلی کھڑکی پر ڈالی اور پھر حیا لودہ انداز میں سکڑ کر اندر گم ہو گئی، کھلی کھڑکی کے پردے بھی گرا لئے۔ جیسے چاند بادل میں چھپ کر متلاشی نظروں کو ستائے۔

بچل دیو مرمریٹ کرتے ہوئے اپنی جگہ دم بخود رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے گھر کی کھڑکی سے سجاو کو دیکھ لیا تھا اور اب وڈیری کی نگاہ کا اٹھنا، حیا سے مسکرا نہ اس سے مخفی نہ نہیں تھا۔ بلقیس کی طرح اسے بھی کچھ خبر ہو چکی تھی، اور اس وقت سجاو کے چہرے سے نہ ہنسی وڈیری کی صرف نکھیں ہی پورا سراپا ہی تشہیر بنا ہوا تھا۔ اس کے دل پر عجیب سا



سناتا تھا۔ یا۔ وہ حیران ہی نہیں پریشان بھی ہو رہا تھا کہ کہاں زمین کہاں سماں۔

بہت رات ہو گئی ہے نا۔ اس نے گاڑی گے بڑھائی تب وہ ہنگامی سے بولی۔

جی سائون بس لڑکے والوں نے زیادہ دیر کر دی کیا کریں ہم دھمی والے ہیں، سائیں

سب برداشت تو کرنا پڑے گا۔ چل کے لہجے میں انکساری تھی۔

ہاں بہت انتظار کرایا لڑکے والوں نے۔ وہ پردہ ہٹا کر باہر اندھیرے میں دیکھنے لگی، ہو

طرف ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ سناں راستوں پر ان کی ہجیر و دوڑ رہی تھی۔ بالکل اچانک

جیپ کے پیہوں کی گھڑ گھڑا ہٹ سنائی دی پھر ایک ہلکی سی چیخ نے اسے چونکا دیا۔ یہ چیخ نسوانی

تھی اور انتہائی بے بس اور بیحد مختصر۔

گڈی روکو چل۔ اس کی نگاہیں دائیں طرف دیکھ رہی تھیں۔ گھنے درختوں کی جھنڈ کی

طرف وہ جیپ اس کے بڑے رئیس مہراں شاہ کی تھی جس میں وہ اپنے دو دمیوں کے ساتھ

بیٹھا تھا جب کا پیچھے تی جیپ میں چار خطرناک قسم کے دی بیٹھے تھے۔

اس کی نکلیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں، ان میں سے دو دمیوں نے درخت کی طرف

بھاگتی لڑکی کو کھینچ کر جیپ میں بٹھالیا تھا، دوسرے لمحے لڑکی کی چیخیں ذرا سی گونج کر دم توڑ گئیں،

یقیناً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا تھا، یا اسے بیہوش کر دیا گیا تھا، اس نے پھر مہراں شاہ کو ہاتھ

لہرا کر کچھ اشارہ کرتے دیکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں جیپیں فرار لے بھرنے لگیں۔

کتنے ہی لمحے اسے اپنی بصارتوں پر اعتبار نہیں یا، لڑکی کی چیخ، اس کا لہراتا ہاتھ، شاخ

میں اٹکتا دوپٹہ، جیب کی گھڑ گھڑا ہٹ ادا مہراں شاہ کی ہنسی۔

سارے منظر ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے اسے یکدم اپنا سانس گھٹتا ہوا محسوس ہوا، اس نے پتھرائی نکھیں کھڑکی سے ہٹا کر چل کی طرف دیکھا جس کا چہرہ گاڑی کے اندر ہونے والی روشنی میں سفید دکھائی دے رہا تھا۔

یہ یہ سب کیا تھا چل۔ وہ بامشکل بول پائی، اس کے خوا اس اب بھی قابو سے باہر تھے۔  
یہ یہ تو ادا مہراں تھا نا۔ اس کی نکھوں یکدم جلنے لگیں۔

ایسا کرو چل، یہ بحیرہ ان راستوں پر لے جاؤ جہاں جیب گئی ہے۔ اس کے لہجے میں یکدم طلاطم امنڈ آیا، پچل لرز اٹھا۔

نن۔۔۔۔ نہیں نہیں ساڑن یہ کسے ہو سکتا ہے۔

کیوں، کیوں نہیں ہو سکتا۔ وہ چلائی بچ بتاؤ چل یہ سب کیا تھا، اندھیرے میں کون سا کھیل کھیلا جا رہا ہے، وہ لڑکی کون تھی جس کی چیخوں کر دبا یا گیا ہے۔

ساڑن معافی مانگتا ہوں، پ کھڑکی کا پردہ گرا لیں۔ پچل نے کہا تو اس نے بڑی زخمی نظروں سے اسے دیکھا، اس کے دل و دماغ میں ندھیاں چل رہی تھیں، دل اس روح فر انکشافات پر دھڑ دھڑ چل رہا تھا چل نے چہرہ سیدھا کر لیا اور گاڑی اشارت کر دی۔

مجھے ایسا لگ رہا ہے چل جیسے یہ سب کچھ پہلی بار نہیں ہوا، ہوتا رہتا ہے، تمہارے چہرے سے لگ رہا ہے تم بار بار ایسے منظر دیکھے ہیں بولو ہے نا یہی بات۔۔۔۔؟ وہ ذرا گے کی اور

پیچھے سے چل کے شانے کو جیسے نوچ بیٹھی۔ وڈیری کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ پ نے جو کچھ دیکھا ہے اسے خواب سمجھ کر بھول جائیں، کوئی فائدہ نہیں نے۔ اوف وہ پیچھے ہٹی، سیٹ کی پشت پر سر کا کر جلتی نکھوں کو زور سے میچ لیا۔

یہ خواب نہیں تھا چل سومرو، یہ سفاک حقیقت تھی جسے کبوتر کی طرح نکھیں بند کر کے جھٹلایا نہیں جاسکتا، یہ خویلی کے عزت دار راکس زادے کی برہنہ فطرت تھی، جو اس دبیز اندھیرے میں اپنی تمام تر خوفناکی کی اور بدنیتی کے ساتھ نمایاں تھی وہ اس لمحے بھوکا بھیریا دکھائی دے رہا تھا، میرے خدا کون ہو سکتی ہے وہ لڑکی، کس باپ کی کس ماں کے جگر کا ٹکڑا ہوگی، کس گھر کی عزت ہوگی جسے رونداجار ہا ہے۔ وہ بے اختیار سسک اٹھی۔

ہم کمدار لوگ ہیں سائون، نکھیں رکھتے ہوئے بھی اندھا رہنا پڑتا ہے۔ اس کی سسکیاں بھیرو کی فضا کو بوجھل کر رہی تھیں اور چل کے دل کو بھی۔

ہونہہ بزدل ہو تم لوگ، اگر اس لڑکی کی جگہ بلقیس ہوتی پھر؟ چل کا پیر زور سے بریک پر پڑا، اس کا چہرہ لال ہو گیا، مگر وہ پلٹا نہیں اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ مضبوطی سے جمائے رہا، پھر دوسرے پل ان نے جیسے اپنے اعصاب کو سنبھال لیا اور انکیشن میں چابی گھمادی۔

تم مردوں کی یہ بے بسی ہی ج، یہ دن دیکھا رہی ہے، ہونہہ تم بزدل ہو چل سومرو، بہت بزدل اگر تمہاری جگہ سجاد ہو تا تو، میری اس بات پر میرا منہ طماچوں سے سرخ کر دیتا اور۔۔۔ اس نے لب بھیج کر مغموں پلکوں کو مونڈ کر گویا چل کے چہرے پر پھیلتی بے بسی اور بیچارگی



سے نگاہیں ہٹالیں۔ اس کا دل ریت کی مانند بیٹھتا جا رہا تھا۔

حویلی پہنچ کر وہ سیدھی اپنی کمرے میں کی اور بیڈ پر اوندھے منہ گر کر بلک بلک کر رودی  
اس کے ذہن کی سطح پر وہ بھیا نک منظر کسی فلم کی طرح چلتا رہا۔

چھو تھوادی زیے۔ ادی عابدہ اس پر جھک کر تشویش سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ خاصی  
رات کو کمرے میں نکلی تھیں۔ وہ سیدھی ہوئی تو عابدہ وہل گئیں اسکی سرخ سرخ متورم آنکھیں  
اور لال چہرہ انہیں دہلا گیا۔

ہائے ماں کیا ہوا تجھے؟

کچھ نہیں ادی، بس ج ایک مان ٹوٹ گیا ہے جسے سانس بان سمجھ رہی تھی وہ تو بالکل کھوکھلا  
درخت نکلا ادی۔ اس کی واز میں ایسی ٹوٹ پھوٹ تھی کہ عابدہ کا دل اندیشوں سے لرز نے  
لگا، وہ اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

کک۔۔۔۔ کیا ہوا میری جان کک۔۔۔۔ کہیں سجاو۔۔۔۔  
نہیں۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور بکھرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے لب کاٹتی اس اذیت کوٹنے  
سرے سے دل پر محسوس کرنے لگی۔

زیے عابدہ نے اس کا شانہ جھنجھوڑ ڈالا، تب وہ اس سے لگ کر بچوں کی طرح رودی، اور  
تمام بات کہہ سنائی، عابدہ حق نواز کا ہاتھ اس کی پشت کو سہلاتے سہلاتے یکدم ٹھٹھر کر رہ گیا،

ان کے چہرے پر پیلاہٹ پھیل گئی۔  
کب؟

ج۔۔۔۔۔ ج بلیٹس کے یہاں سے رہی تھی تب ادا کی جیپ دیکھی، اس کے پیچھے بھی اس کے دمیوں کی جیپ تھی اور انہوں نے۔۔۔۔۔ ادی۔ وہ اور شدت سے رونے لگی۔

عابدہ کے لبوں سے ایک گہری مضحل سانس خارج ہو گئی، انہوں نے نرمی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے اسے خود سے الگ کیا اور بیڈ سے کھڑی ہو گئیں۔ کمرے میں چند سانپے گہرا سکوت رہا جسے وقفے وقفے سے صرف زیمیل کی سسکیاں چیرتی رہیں۔  
ایسی کتنی چٹخیں رات کے اندھیروں میں ابھر کر دم توڑتی رہی ہیں اور نہ جانے کتنی دم توڑتی رہیں گی یہ کوئی پہلا واقعہ تو نہیں ہوا۔

دی عابدہ کی واز سناٹے کو چیرتی بڑی بیبت اور یاسیت سے بھری، ابھری زیمیل نے چونک کر سر اٹھایا اس کے منکٹے نسو پلکوں کی دیواروں پر ٹھہر گئے۔ کیا، کیا مطلب ادی۔  
ہاں، اس حویلی میں اور دوسری حویلیوں میں ایسی کتنی بد نصیبوں کو روند ا گیا ہے۔ ادی عابدہ نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے ایک گہری سانس کھینچی زیمیل سناٹے میں رہ گئی۔  
اس کا مطلب ہے تم، تم بھی ادی چل کی طرح سب جانتی ہو، یہ کھیل بہت پرانا ہے اس کی واز کپکپا رہی تھی، عابدہ حق نواز کے لبوں پر ایک مسکراہٹ لہرا کر منجمد ہو گئی۔

ہاں، بہت پرانا، جب مں نے شعور کی سیڑھی پر قدم بھی نہیں رکھا تھا ایسی بہت سی چٹخیں سماعت سے نکراتی تھیں۔

سکيا ---- زيميل جھلکے سے بيڈ سے کھڑی ہو گئی۔

اس وقت ---- اس وقت ادی تب تو ادا مہراں شاہ بچہ ---- اس نے الجھ کر ادی کا چہرہ دیکھا۔

ہاں مہراں تو اس وقت جھولے میں ہوا کرتا تھا مگر بابا سائیں تو تھے نا۔

انہوں نے یہ کہہ کر نظریں فرش پر گاڑ دیں، زيميل کے چہرے پر پھیلتے تاثرات کو دیکھنے کا یا رانہ تھا وہ تحیر میز بینقینی سے ادی کو دیکھ رہی تھی پھر جیسے گھبرا کر نگاہیں سامنے دیوار پر کر لیں اس کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے اعصاب تند ہوا میں ے پودوں کی طرح بکھرنے لگے تھے یکا یک اس کی نکھیں یوں جلنے لگیں جیسے عابدہ نے ان میں مرچیں ڈال دی ہوں، رونا چاہا مگر رو بھی نہ سکی، بس ذہن و دل میں اٹتے طوفان کا شور سنتی رہی، اس انکشاف نے اسے شل کر دیا تھا۔

تجھے کیا خبر چری لڑکی، ہم جنہیں گھنا سا یہ سمجھ رہے ہیں وہ تو خزاں رسیدہ درخت ہیں ہم جنہیں اپنا فخر اپنا مان کہتے ہیں وہ تو خود ہمارے لیے ہنی زنجیریں ہیں گوٹھ کے لوگ خوف سے زبان بندی پر مجبور ہیں۔

یہاں مرد بھی اتنی مظلوم ہیں تو پھر عورت کا تو پوچھ ہی مت، ساری کانٹوں جیسی رسمیں ان



ہی کے خون سے نبھائی جاتی ہیں کہیں کاروکاری ہے تو کہیں سام بنا کر عورت پر مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔

مجھے دیکھ میرا حق قرآن سے بخشوا دیا گیا ہے، اس صدی میں ایسی جاہلانہ رسمیں ہیں مگر نہیں درحقیقت ہمارے مرد جاہل نہیں ہیں ظالم لالچی اور خود غرض ہیں۔ ایسی رسموں کا سہارا لے کر اپنی لالچ پر پردہ ڈالتے ہیں۔ یقین کر زیمی اگر یہ اونچی اونچی جوئیلیاں مردوں کے لیے ہیں ساری خوشیاں مردوں کے لیے ہیں اثر و رسوخ وہ صرف اپنے لیے استعمال کرتے ہیں، دولت سے وہ صرف اور دولت کھینچنے کا کام لیتے ہیں انہیں کسی غریب کی ہوں کی فکر نہیں۔ تو کس کس کر روئے گی ذیل۔

یہ بڑی بڑی باتیں کرنے والے معاشرے میں بد حالی ختم کرنے اور خوشحالی لانے کے دعوے کرنے۔۔۔۔۔ والے کوئی ان کے اندر جھانکے کہ ان کی روئیں تک کتنی بد حال اور سڑی ہوئی ہیں، ان کے مردہ ضمیروں سے کتنی بدبو اٹھتی ہے، وہ بھلا معاشرے میں کیا شائستگی کیا روشنی لاسکیں گے۔

یہ تو کمزوروں اور غریبوں کے اندھیروں کو اور گہرے کرنے والے ہیں، ذیل ان کے سر عورتوں کی پیدائش پر جھکتے ہیں، مگر بابا سائیں کا سر بیٹے کے اور اپنے کر تو توں پر فخر کرتا ہے، ہا۔۔۔۔۔ فخر جو جانتے ہی نہیں فخر اور شرم میں فرق کیا ہے۔

عابدہ حق نواز کی واز بڑی کاٹ دار تھی وہ ہنس رہی تھیں، مگر ان کی ہنسی ایسی تھی جیسے خالی

برتن میں بہت سے پتھر ڈال دیئے گئے ہوں زیمیل بیڈ پر اندھے منہ گر کر رہے واز روئی رہی۔  
صبح اس کی نگاہ بہت دیر سے کھلی، وہ نیچے کھانے کے کمرے میں لی تو سب ناشتہ کر  
چکے تھے، بڑی سی میز پر بس مہران شاہ ابھی کر بیٹھا تھا، وہ بھی کر بیٹھ گئی، چھوٹی ماں بھاگل  
کو ہدایتیں دے رہی تھیں، ادی عابدہ رسوئی میں تھیں، اور جانے کیا تلاش کرنے لگیں تھیں  
ان کی نظریں یوں ہی زیمیل پر اٹھیں مگر وہ مہران شاہ کو دیکھ رہی تھیں پھر اچانک اپنی جگہ سے  
اٹھی اور دو کرسیاں چھوڑ کر دور جا کر بیٹھ گئی۔

سرخ سرخ انگارہ نکھیں جس میں نیند کا خمار تھا یا نہ جانے کس کا اثر وہ اپنے سامنے  
رکھے ناشتے کا بغور جائزہ لے رہا تھا، اسے اس بات کی قطعاً پرواہ نہیں تھی کہ اس کمرے میں  
کون کون ہے اور زیمیل کیوں اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔

لا ادھر دے اخبار، کوئی خبر شبر ہے خاص۔ اس نے اس کے سامنے پڑا اخبار مانگا تو اس  
نے خاموشی سے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

بہت سی خبریں اخباروں میں نہیں چھپتیں ادا، شاید اس لئے کہ کسی کو کانوں کان خبر ہی نہیں  
ہوتی اور گھر جل جاتے ہیں لوگ چپ چاپ مر جاتے ہیں اور دفن ہو جاتے ہیں اپنے ہی تن کی  
قبروں میں۔

اس نے روئی توڑتے ہوئے ہستکی سے کہا تو مہران شاہ نے زرا سا سر اٹھا کر سامنے نظر  
ڈالی پھر بے پروائی سے دوبارہ اخبار کے صفحے پر نظریں دوڑانے لگا۔

سائیزن ج ایک بہت بری خبر ہے میرے پاس۔

بھاگل اس کے گے چائے رکھتے ہوئے دھیرے سے بولی تو زیمیل کا دل جانے کیوں  
دھڑک اٹھا وہ اس کے بالکل قریب رازدارانہ انداز میں کھڑی تھی اور وارز بھی ہستہ تھی، یوں  
بھی رئیس مہراں شاہ کی موجودگی میں ہر ملازم بلکہ گھر کے ہر فرد کی وارز پست رہتی تھی۔  
کیسی خبر گوٹھ کی ہے کوئی۔

ہا سائیزن گوٹھ کی خبر ہی تو ہوتی ہے میرے پاس، وہ زہرہ ہے نا چچا دھی کی دھی، صبح اس  
کی لاش کنواں سے ملی ہے، وہ کچھواڑے ندی کے پاس والا خالی کنواں ہے نا اس میں، لاں  
گوٹھ کے مردوں نے اپنی نکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ یہ کہہ کر ٹیبل سے دوسرے جھوٹے برتن  
اٹھانے لگی، زیمیل کے ہاتھ سے نوالی چھوٹ گیا۔  
زہرہ کون زہرہ، وہی جورات کو اغوا ہوئی تھی۔

بے اختیار اس کے منہ سے پھسل پڑا، مہراں شاہ نے چونک کر اسکی طرف دیکھا، اس کی  
لاں نکھوں میں حیرت جھلکی، اماں اور عابدہ بھی اس کی طرف متوجہ تھیں، جب کہ بھاگل ٹکر ٹکر  
وڈیری زیمیل کا منہ بکنے لگی تھی۔  
اغوا۔

کک۔۔۔۔۔ کیسے مر گئی، کنواں میں کیسے گر گئی وہ مہراں شاہ کی لال ہوئی نظروں سے  
نکالیں چراتے ہوئے اس نے بھاگل کو دیکھا۔



سائیزن چھو خبر، پر گوٹھ والے تو سب یہی کہتے ہیں اسے جان کر چھلانگ لگائی تھی، اللہ  
معاف کرے مجھے تو یقین نہیں تا سائیزن ایسی نیک بچی تھی اپنے ماں باپ کی ایک ہی تھی سخی  
بھی ایسی تھی نظر بھر کا دیکھ لیں تو نظر لگ جائے سچ مچ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں تا۔

بک بک بند کر، جادفع ہو جا، صبح صبح ایسی منحوس خبریں سنانے بیٹھ جاتی ہے دماغ خراب  
نہ کر جا۔ اچانک مہران شاہ کی کڑک دار واز گونجی، اور بھاگل شپٹا کروہاں سے کھسک لی۔  
یہ خبر تو سچ اخبار میں نہیں چھپی ہے نا ادا۔ وہ کچھ توقف کے بعد بولی اور استہزائیہ بنی۔

چپ چاپ ناشتا کر دماغ خراب نہ کر میرا۔ جواب ویسا ہی کھر درا یا۔  
پڑھ لینا اخبار تو بھی، ناشتہ تو کر لے پہلے دھی رانی۔ چھوٹی اماں اس سے مخاطب ہوئیں  
گویا مہران شاہ کو اب نہ چھیڑنے کی تنبیہ شامل تھی، مگر اس کا دل جل رہا تھا انگاروں پر لوٹ رہا  
تھا، رات کا وہ خونفناک منظر پھر نگاہوں میں پھرنے لگا۔

اماں، زہرہ نے خودکشی کی ہوگی، اسے مرنے پر مجبور کیا گیا ہوگا نا پتا نہیں ایسا کب تک ہو  
گا اس کے مجرموں کو کون بے نقاب کرے گا اور کون انہیں۔۔۔۔۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گئی۔  
مہران شاہ چائے کا کپ زور سے ٹیبل پر پٹخ کر کرسی دھکیل کر کھڑا ہو گیا تھا۔

اس بھاگل سے کہنا وہ اپنی منحوس صورت لے کر حویلی سے دفع ہو جائے سوائے گوٹھ  
والوں کی ٹوہ میں رہنے کے اور کوئی کام نہیں تا، اور تو، دو کتابیں پڑھ کر بہت بکا اس کرنے لگی  
ہے۔ وہ مٹھیاں بھینچتا اس تک یا۔

تجھے گوٹھ کی سب لڑکیوں کے مرنے جینے کی خبریں رکھنے کی ضرورت نہیں ہے، بس اپنا  
کھانا پینا دیکھ۔ وہ شعلہ بار نظروں سے اسے دیکھتا کمرے سے دھم دھم کرتا نکل گیا۔  
اے بھامانی تو کھالے۔ چھوٹی ماں اس کے پیچھے لپکیں پھرواپس سگنیں۔

پتا نہیں صبح صبح کیا ہو گیا اسے۔  
شیطان چڑھا ہوا ہے اماں۔ وہ ہستکی سے بڑبڑائی اور خود بھی ناشتہ ادھورا چھوڑ کر چلی  
گئی۔

لے اب اسے کیا ہوا؟  
چھوڑو اماں اسے میں بعد میں سمجھا لوں گی غصہ گیا ہوگا۔ ادی عابدہ سر جھٹک کر خیراں  
کے ساتھ ٹیبل صاف کرنے لگیں۔

اوساجول او بابا ساجول پٹ غلام محمد نے ایک سیڑھی پر قدم رکھ کر حجرے نما حصے کے اندر  
جھانکا۔

و وچا چا اندر جاؤ۔ ساجول نے باہر نکل کر ہاتھ گے کر کے انہیں سہارا دیا۔  
پٹ تم ادھر ہو، میں بابا تمہیں پچھوڑے نالے پر بھی دیکھ یا کیا یار دوستوں کی محفل جمائی  
ہے پھر تو میں غلط وقت پر گیا بابا۔ غلام محمد فرش پر پچھی دری پر لڑکوں کو دیکھ کر زرا ساجینپ  
گیا۔

ارے نہیں چاچا، بس یوں ہی بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے بیٹھو بیٹھو چاچا۔ اس نے بڑے

احترام سے غلام احمد کو کرسی پیش کر دی۔

ہٹ تم جو خواب دیکھ رہے ہو بڑے مشکل ہیں میری مانو تو تم رئیسوں سے نہ ہی الجھو تو اچھا ہے۔ غلام محمد کے چہرے پر اس کی باتیں سن کر فکر مندی جھلکنے لگی تھی۔

بس چاچا تم بزرگ لوگوں کی باتیں ہی جوانوں کے حوصلوں کو پچھاڑ دیتی ہیں، خرکسی کو تو گے نا ہے۔ فرش پر بیٹھا کھو کر بھنا گیا۔

یہ ہمارا حق ہے چاچا، کیا حق کے لئے وازاٹھانا جرم ہے میں نے تو محض بابا سائیں کی وجہ سے نہری پانی کے مسئلے پر بھی چپ سادھ لی وار بندی پر بھی پ تو راضی ہیں ورنہ میں پیچھے ہرگز نہ ہٹتا، مگر اب اسکول کی یہاں بہت ضرورت ہے بلکہ یہ ناگزیر ہے۔ پھر ہم خود رضا کارانہ طور پر کھول رہے ہیں وڈیہ لوگوں کو کیا تکلیف ہوگی سجاوِل کا لہجہ پر عزم اور کھردراتھا جو اس کی ذات کا خاصہ تھا۔

گوٹھ کے کئی لڑکے اس کیساتھ تھے کئی پڑھے لکھے تھے جو رضا کارانہ طور پر اپنا وقت اسکول اور بچوں کو دینے پر تیار تھے، ابھی تو وہ لوگ سجاوِل کے گھر کے پچھلے حصے میں جو خالی پڑا تھا اسکول کھول رہے تھے کچھ چندے اکٹھے کر رہے تھے اور سجاوِل کا خیال تھا وہ شہر جا کر کچھ بڑے لوگوں سے اپنی جان پہچان والوں سے مشورے اور پیسے اکٹھے کر لائے گا۔

بس ابتدا ہو جائے چاچا الف پڑھا جائے تو یقین کریں لوگ اللہ کو جان لیں گے اور ان جھوٹے معبودوں کے گے جھکنا اور ان سے ڈرنا چھوڑ دیں گے ہم لوگوں کی زندگی اتنی ارزاں



اتنی بے حیثیت نہیں ہے کہ بلا تفسیر سر جھکایا جائے۔ ہر انسان برابر ہے چاہا ہر شخص کو بولنے کا حق ہے اپنے نفع و نقصان کے سوچنے کا اس پر واز اٹھانے کا حق ہے مگر ہم نے یہ حق خود ہی ان رئیسوں اور وڈیروں کے قدموں میں رکھ دیا ہے۔

میں تو کہتا ہوں سراتنے نہ جھکاؤ کہ کوئی گردن پر با سانی پیر رکھ دے اور نہ اتنا اٹھاؤ کہ خدا ناراض ہو کر اسے اپنی تقدیر سے جھکانے پر مجبور کر دے عزت کے ساتھ رہنا چاہیے، عزت نفس غریب کی بھی ہوتی ہے کوئی بڑا کوئی چھوٹا نہیں، یہ اونچ نیچ کچھ ہماری بزدلی سے پیدا ہو گئی ہے کچھ ہماری کم عقلی سے ان باتوں کے شعور کے لئے تعلیم پہلا قدم ہے اور پہلا قدم کسی کو تو اٹھانا ہی ہے کیوں نہ وہ قدم ہم ہی اٹھالیں۔

سجاد کا چہرہ اس کا رواں رواں بول رہا تھا، وہاں موجود سب کے دلوں کو سحر زدہ کر رہا تھا۔

یہ باتیں صرف الفاظ نہیں تھے سچ تھا جو عقل کے درتے کھول رہا تھا، بس بات ساری خدا پر توکل کرنے، ہمت اور حوصلے کی تھی، اور یہ حوصلہ سجاد علی شاہ سب میں قطرہ قطرہ انڈیل رہا تھا۔

بشارتوں کا دروان کیلئے نہیں ہے۔

جو منتظر ہیں

سکون کی منزل خود پ چل کے قریب ے

حصول منزل بنا سفر کے نہ ہو سکا ہے

نہ ہوگا

مسافروں کے لئے

سفر کا شعور لازم ہے

سجاول غلام محمد کے ساتھ جب باہر یا تو دھوپ ڈھل چکی تھی موسم بڑا سہانا ہو رہا تھا اسے  
ج کئی باشعور نوجوانوں کی حمایتیں حاصل ہو گئی تھیں۔ وہ جانتا تھا یہ سب کچھ اتنا سانا نہیں  
ہے مگر ناممکن بھی نہیں تھا اور مشکل اسی وقت مشکل رہتی ہے جب اسے سر نہ کیا جائے۔

گوٹھ کے لوگوں کی بے بسی پر وہ کڑھتا اور جلتا تھا اس کے خیال میں وہ لوگ راہ بھولا ہوا  
وہ قبیلہ ہیں جو ٹھکانہ بھول چکا ہوا ایسی زادی کے خواب کس نے دیکھے تھے یہ زادی تو نہیں تھی  
جو قائد اعظم نے دلائی تھی اقبال نے جس کی نوید دی تھی، یا شاید راہ تے تے ہی قبیلہ اپنی  
بزولی اور کم ہمتی سے راہ بھٹک گیا تھا، جہاں اب سوائے دکھ کی دھوپ اور اذیت کے بگولوں  
کے کچھ نہیں تھا اور وہ ان کا یہی شعور بیدار کرنا چاہتا تھا کہ یہ جو تو نگروں طاقدروں کی تجوریوں  
میں سکے کھنک رہے ہیں یہ سب ان ہی محنت کش ہاتھوں کی کمائی

ہے یہ جوزینیں ہیں ان کے مالک یہ لوگ نہیں ہیں بلکہ وہ جوان بازو ہیں جو اس مٹی میں  
اپنے پسینے کے قطرے کی چمک کے ساتھ بیج بو تے ہیں۔ بنجر زمین کو سرسبز و شاداب کرتے

ہیں۔

سجاول پٹ مجھے تجھ پر فخر ہے پر بابا تو اکیلا ہے اور۔ چا چا غلام محمد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ اپنی سوچوں سے نکل یا۔

ان وڈیروں سرکار لوگوں سے ٹکر لینا کوئی معمولی بات نہیں ہے وہ تو ہم غریبوں کو یوں مسل ڈالتے ہیں جیسے سوکھے پتے ہوں ہم۔

یہی تو المیہ ہے چا چا سائیں کہ ہم سوکھے پتے اور کمزور ٹہنی بن کر رہ گئے ہیں انہیں سر پر چڑھا دیا ہے انہیں خدا مان لیا ہے یہ کچھ بھی نہیں ہیں، چا چا اگر ہم ہیں تو یہ ہیں ہم نہیں تو یہ بھی نہیں۔

پر پٹ  
دیکھو چا چا اوپر چڑھنے کے لئے سیڑھی کی ضرورت پڑتی ہے یا۔ اس نے مسکرا کر غلام محمد کو دیکھا۔

ہاں۔  
بس تو یہ سمجھو ہم سیڑھی ہیں اگر سیڑھی نہ ہو کسی کی مجال اوپر تک پہنچ سکے، بس سیڑھی کو اپنی حیثیت اور اہمیت کا احساس ہونا چاہئے۔

ہاں پٹ یہ تو ہے۔  
چا چا کی موٹی عقل میں کچھ تو یا تھا جو وہ سر ہلانے لگا تھا، سجاول بڑی سنجیدگی سے مسکرا دیا۔





پتا نہیں کیوں رئیس مہران شاہ نے حویلی سے نکال دیا ہے مائی زریںہ میرے پاس کی تھی اس کا پیغام لے کر پھر میں جا ہی نہیں سکی۔

ہوں، تم چاچا کو ٹھنڈی چھا چھ دو، میں ذرا کپڑے بدل لوں۔ وہ بات کے جواب میں بس اتنا کہہ کر کمرے کے اندر چلا گیا۔

نکھوں کے درتے

تب سے کھے ہیں

جب سے تمہیں دیکھا ہے

مجھے ایسا لگا کہ

زندگی میری

تیری نکھوں میں

اتر چکی ہے

اس نے ڈائری کے اندر بال پین رکھ کر ڈائری بند کر دی اور اس پر سر ٹکا کر جذبوں سے

بھری بوجھل مخمور نکھیں موند لیں۔

اسی دم دروازہ زور سے کھلا وہ جلدی سے سیدھی ہو بیٹھی، رئیس مہران شاہ دروازے کی

چوکھٹ پر کھڑا تھا۔

مہران شاہ کو اپنے کمرے کے دروازے پر دیکھ کر اس نے ڈائری جلدی سے تکیے کے

نیچے سیز دی اور قریب پڑی اجرک اٹھا کر بدن پر ڈال لی۔

رئیس مہراں شاہ کبھی بہنوں کے کمرے میں اس طرح بلا دستک نہیں یا کرتا تھا جغ بغیر دستک دیے دروازہ کھول کر اندر جانے والے فعل سے وہ خفیف سا ہو کر رہ گیا۔ کوئی کام ہے ادا۔

ہوں۔ اس نے ہنکارا بھرا اور دو قدم اندر گیا۔ کیا کر رہی ہو؟ اس نے یوں ہی کمرے میں طائرانہ نظر ڈالی پھر اس کے چہرے پر اپنی نکمیں گاڑ دیں۔

ایک پل زمیل کا دل بہت زور سے دھڑکا، مہراں شاہ کے چہرے پر پتھر یلا پن نظر رہا تھا، جس کے پیچھے ابلتا غصے کا سرخ خون تھا۔

کوئی کام تھا تو مجھے بلوایا ہوتا ادا۔ وہ احترام بولی۔

تجھے زہرہ کے بارے میں کس نے بتایا۔

اس نے اس کی بات کاٹی اور کچھ فاصلے پر رک کر بغیر تمہید کے بولا، اس کے سوال پر زمیل نے سر اٹھایا مگر دوسرے لمحے گھبرا کر جھکا دیا۔

کیا مطلب۔۔۔۔۔ کیا زہرہ کے بارے میں۔

دیکھو زمیل میں لگی لپٹی بات کرنے کا عادی نہیں ہوں، نہ میں اتنا احمق اور سیدھا ہوں، تجھے کسی نے بتایا کہ اس لڑکی کو میں نے اغوا کیا تھا۔

اس نے گویا دھماکے سے زمیل حق نواز کے سر پر اینٹ دے ماری اس کے اعصاب لمحہ



بھر کے لئے سن ہو گئی، سینے کی چہار دیواری میں دل زور سے دھڑکنے لگا۔

بول، کس خدا نے تجھے یہ خبر پہنچائی، اس حویلی میں ایسی باتیں کرنے والا کون ہے جس نے میری پیٹھ میں چھرا گھونپا ہے، بتا زیے میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ وہ بے حد مشتعل دکھائی دے رہا تھا، یوں جیسے زہیل کے منہ سے کسی کا نام سنتے ہی وہ اس کا خون کرنے چل دے گا۔

یہاں تو ادا، سب ہاتھ جوڑ کر سر جھکانے والے غلام ہیں، تیرے، کون نمک حرامی کی جسارت کر سکتا ہے۔ وہ بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی، ریکس مہران نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گویا چھید ہی ڈالا۔

زیادہ فلسفہ نہ بول، سیدھا سادا جواب دے جو پوچھ رہا ہوں۔ اس کی واز دھیمی مگر کرخت تھی۔

وہ اضطرابی انداز میں ہاتھ مسلنے لگی، اس کا دل خوف کی دلدل میں دھنستا اور ابھرتا جا رہا تھا پھر ہمت کر کے اس نے سر اٹھایا۔

میں نے، میں نے اپنی نکھوں سے دیکھا تھا ادا وہ منظر۔ اس کی واز پست تھی مگر مہران شاہ کی سماعت تک پہنچ گئی تھی، اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، فوری طور پر وہ کچھ بھی نہ بول سکا، چہرہ لال ہو گیا، ہونٹ بھیجنے گئے، نظریں اس کے چہرے سے ہٹا کر دیوار پر کر لیں مگر دوسرے ہی لمحے وہ اپنی کھسیا ہٹ غصے میں چھپاتا ہوا دھاڑا۔

جھوٹ بول رہی ہے تو، پردہ رکھ رہی ہے کسی کا تو بھلا رات کو باہر کہاں تھی۔

میں گڈی میں تھی، پچل کی سھین (بہن) کی سگائی سے رہی تھی تب۔ اس میں جانے کیسے اتنی ہمت گئی تھی کہ وہ بھرے ہوئے مہراں شاہ کے سامنے بغیر جھجکے بول رہی تھی۔

شاید اس لئے کہ اس کی پوزیشن کمزور تھی اور وہ خود بے قصور بلکہ اس کی کمزوری اس کے ہاتھ میں تھی مگر بہر حال وہ ناشائستہ بھی نہ تھی کہ اس کا کوئی فائدہ اٹھانے کا سوچتی۔

ادھر غسل خانے سے نکلتی عابدہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا تھا، انہوں نے مہراں شاہ کی واز پر جلدی سے دروازہ کھول ڈالا تھا اور اب ہاتھ میں تولیہ پکڑے ساکت کھڑی تھیں تولیہ سے منہ پوچھنا بھی بھول گئی تھیں۔

میں ویسے بھی سنی سنائی باتوں پر زیادہ یقین نہیں کرتی ادا۔

اچھا زیادہ بک بک نہ کر، تجھے بابا سائیں نے شاید زیادہ ہی زادی دے رکھی ہے۔ مہراں شاہ کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

تو نیاغزی (بہن بیٹی) نہ ہوتی تو میں تجھے اس بکواس پر دھن کر رکھ دیتا، کان کھول کر سن لے زیمیل، تو نے جو دیکھا اسے بھول جا، تیرے حق میں یہی بہتر ہے ورنہ۔

میں تو بھول جاؤں گی ادا پر خدا تو نہیں بھولے گا۔

زیمیل۔ وہ غضبناک ہو کر اس کی طرف بڑھا، اس کا بھارہ ہاتھ فضا میں اٹھا ہی تھا کہ سرعت سے قریب تی ادی عابدہ نے پکڑ لیا۔

نہ ادا، یہ ابھی نا سمجھ ہے۔ اس نے نرمی سے بھائی کا ہاتھ جھٹک دیا۔

اسے سمجھا دے ادی، نا سمجھ ہے تو اتنی سمجھداری دکھانے کی ضرورت نہیں ہے اسے، ورنہ کسی دن میرے ہاتھوں سے قتل ہو جائے گی، چار جماعتیں پڑھ کر خود کو نہ جانے کیا سمجھتی ہے۔

وہ اسے تیغ صفت نظروں سے گھورتا، قدموں سے زمین کو روندتا کمرے سے اوجھل ہو گیا۔

زیمل نے دکھ کے ساتھ، کمرے کا دھماکے سے بند ہوتے دروازے کو دیکھا پھر بیڈ پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ لیا۔

نفرت غصے اور تاسف سے اس کی آنکھوں میں دھند کا غبار چھا گیا۔

بہت بری بات ہے زیمل، جیسا بھی ہے وہ بھائی ہے تیرا، سرکا نچل ہے ہمارا، چری، دکھ اور غصہ مل جائے تو بڑی تباہیاں آتی ہیں۔ ادی عابدہ سرزنش کرنے والے انداز میں بولیں اور کرسی پر بیٹھ کر اپنی چوٹی کے بل کھولنے لگیں۔

اونہہ، ہمارے سرکا نچل ہیں، مگر کتنے سروں کی چادریں کھینچ رہے ہیں عورت صرف جوہلی کی عورتیں تو نہیں ہیں ادی، عزت اس جوہلی کی عورتوں کی ہی نہیں ہوتی، میرا دل جل رہا ہے ادی، ادا مہراں بجائے شرمسار ہونے کے الٹا مجھے دھمکی دے گیا زبان بندی کی۔

اچھا بس، جو ہو گیا اسے بھول جا، تیرے دل جلانے اور کڑھنے سے نظام نہیں بدلے گا،



نہ زہرہ واپس زندہ ہو جائے گا، چل اٹھ تجھے زینت ماں بلا رہی تھیں۔

عابدہ کا چہرہ بڑا سپاٹ تھا، جیسے اس سارے واقعے کا خاص نوٹس نہ لیا ہو، زیمیل نے نکمھیں اٹھا کر انہیں ایک نظر دیکھا۔

تو یہ چاہتی ہے ادی کہ میں بھی تیری طرح بے حس، بے تاثر اور تمام جذبوں سے عاری ہو جاؤں اپنے تمام احساسات اور فطری رویوں پر اتنی برف گرا دوں کہ میرا وجود بھی ایک تودہ ہو جائے نہیں میں ایسی زندگی نہیں گزار سکتی۔ وہ اپنے دماغ کی کھولن کم کرنے کے لئے ہاتھ روم میں چلی گئی۔

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں

اپنے نام کی تختی والی ایک عمارت

کتنے دکھوں کی اینٹیں چن کر گھر بنتی ہے

پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو

میں نے کبھی ایک گھر ہے بنایا

رنگوں، پھولوں، تصویروں سے اس کو سجایا

دروازے کی لوح پہ اپنا نام لکھایا

لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو

سجاوٹ شاہ نے اپنی روشن نکمھیں اوپر اٹھائیں اور زیمیل کو دیکھا جس کے رخساروں پر

محبت پالینے کا نشہ سرخی بن کر جھلک رہا تھا سجاوِل سے نظریں ملیں تو اس نے اپنی پلکیں جھکا دیں۔

سوچتا ہوں اتنا بوجھ اٹھا سکوں گا بھی یا نہیں۔

اس کے لہجے میں سرشاری بھی تھی اور بے یقینی بھی، اس نے خوب صورت کارڈ پر لکھی نظم پر نظریں ڈالیں پھر اسے اپنی رائٹنگ میبل پر رکھی ڈائری میں احتیاط سے رکھ دیا جیسے کوئی بہت قیمتی شے ہو۔

محبت بوجھ تو نہیں ہوتی سجاوِل۔

وہ کرسی پر بیٹھ گئی مگر نظریں نہ اٹھائیں ہاتھوں میں پڑے کنکرن پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ ارے، وڈیری زیمیل حق نواز، تم تو شاعرہ اور فلسفی ہو گئی ہو۔ وہ ذرا سا ہنس دیا اور دیوار سے لگ کر اسے محبت بھری نظروں سے دیکھنے لگا۔

وہ ج اس سے ملنے کی تھی اپنے چاچا کے گھر کا بہانہ کر کے چل ہی اسے گاڑی میں چھوڑ گیا تھا، وہ بڑا خاموش رازداں بن گیا تھا اور گھر میں اس کی سکھی بلقیس تھی جو اس دو طرفہ محبت پر مسرور بھی تھی اور خوفزدہ بھی۔

تم کل جا رہے ہو شہر۔

وہ اسکی نگاہوں کی محویت توڑنے کی خاطر بولی، کیا سجاوِل کی روشن صورت نکھوں میں تھا، ایسے رنگ تھے کہ اس کا دل شوریدہ سر ہونے لگا تھا۔

ہوں، ہاں جاتو رہا ہوں۔

پھر کب ڈگے۔ اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

نا جانا تو رہتا ہی ہے نا، بس پڑھائی کے تو صرف چھ ماہ ہیں۔

سجاول۔ وہ اضطرابی انداز میں اپنی نازک نازک انگلیاں ایک دوسرے میں

پھنسائے کرسی سے اٹھ گئی۔

نہیں زبیل اپنے دل میں کسی خدشے کو جگہ نہ دینا، سجاول شاہ تم سے کوئی کھیل نہیں کھیل

رہا۔

سجاول کا چہرہ یکدم سنجیدگی میں ڈھل گیا وہ زبیل حق نواز کے اضطراب پر یہ ہی نتیجہ اخذ

کر سکا تھا وہ تڑپ گئی۔

نہیں سجاول، خدا نہ کرے نہ میں کبھی ایسا سوچوں، پر مجھے وسوسے ستانے لگے ہیں، مجھے

ڈر لگنے لگا ہے۔ اس کی دواز کا نپ گئی، اس کے تصور میں مہراں شاہ کا سراپا ابھر یا۔

کل رات اس نے جو وہ اس کے ساتھ اپنایا تھا۔

اس کا تو کبھی اسے گمان بھی نہ تھا کہ وہ اس کے سر کا سا تمیں، اس کا بھائی ہو کر اس کے

ساتھ ایسے پیش آئے گا اب ایک عجیب طرح کا خوف اس کے اندر سمٹنے لگا تھا، اس کی پلکوں پر

خود بخود نمی بکھر گئی۔

سجاول نے بے اختیار اس کی وہ لابی انگلیاں اپنی مضبوط انگلیوں میں تھام لیں۔



زیمیل کا چہرہ ایک پل اس کے لمس کی حدت سے سرخ ہوا۔

اب ڈرنے لگی ہو، کیا وڈیری بن کر سوچنے لگی ہو۔ وہ ہولے سے ہنسا۔

میں تو تمہیں بڑا بہادر سمجھ رہا تھا، وڈیری حق نواز، پر تم تو وہی چڑیا جتنا دل رکھنے والی لڑکی

نکلے۔ وہ اس کے ہنسنے اور لطیف طنز پر برامانے بغیر مسکرا دی۔

سجاوِل شاہ لڑکی خواہ کسی طبقے کسی خطے کی ہو، ایک سادل رکھتی ہے اور جب سمجھیں

خوابوں سے سج جائیں دل تمناؤں کے سیل شوق میں بہنے لگے، تو خود بخود، وسوسے اور اندیشے

سراٹھانے لگتے ہیں، میں اب ڈرنے لگی ہوں سجاوِل کہ میں کچھ کھونا نہیں چاہتی

اتنی بڑی ان دنیاؤں میں

اپنے نام کی سختی والی ایک عمارت

کتنے دکھوں کی اینٹیں چن کر گھر بنتی ہے

پتھر پتھر جوڑ کے دیکھو

میں نے کبھی ایک گھر ہے بنایا

رنگوں، پھولوں، تصویروں سے اس کو سجایا

دروازے کی لوح پہ اپنا نام لکھایا

لیکن اس کے ہر کمرے میں تم رہتے ہو

سجاوِل شاہ نے اپنی روشن سمجھیں اوپر اٹھائیں اور زیمیل کو دیکھا جس کے رخساروں پر

محبت پالینے کا نشہ سرخی بن کر جھلک رہا تھا سجاوِل سے نظریں ملیں تو اس نے اپنی پانا چاہتی ہوں۔ اس نے چہرہ اوپر اٹھا کر اپنے قریب کھڑے سجاوِل علی شاہ کو دیکھا۔ مگر کچھ پانے کے لئے کچھ کھونا تو پڑتا ہی ہے۔ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر اس سے دور ہٹ کر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

میرے نزدیک، بے حیثیت، فانی اور مادی چیزوں کی کوئی حیثیت نہیں ہے، تمہارا مطلب اگر میرے اونچے مرتبے، حویلی اور جائیداد سے ہے تو، میں نے کبھی ان چیزوں کو جذبول کے گمراہی نہیں دی، مجھے اپنے خواب اور زیادہ عزیز ہیں۔

وہ رخ کھڑکی کی طرف کر کے باہر دیکھنے لگی کہ یکدم اس کی آنکھیں چمک اٹھیں، وہ کھڑکی پر جھولتا پردہ پورا ہٹا کر اب باہر غور سے دیکھ رہی تھی، لگ رہا تھا کوئی بہت خوش کن منظر دیکھ رہی ہے، وہ خوشی خوشی پلٹی۔

سجاول۔۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔۔ اس کی نکھوں میں خوشگوار حیرت تھی،  
سجاول کھڑکی کے پاس چلا یا اور باہر دیکھنے لگا، اس کا چہرہ بھی چمکنے لگا، وہ بڑی طمانیت سے  
مسکراتے لگا۔

ہاں، یہ اسکول ہے جو رات دن کی محنت کے بعد کھلا ہے، نام نہاد اسکول ہی سمجھو۔

کب کھلایہ۔ وہ پرست لہجے میں پوچھتے ہوئے پھر باہر جھانکنے لگی۔

بس ہفتہ بھر ہوا ہے، جگہ خالی پڑی رہتی تھی، بابا سائیں یہاں دو کمرے بنوانا چاہ رہے

تھے مگر میں نے یہ خالی حصہ اسکول کے لئے لے لیا، و تمہیں دکھاؤں۔ وہ اس کا ہاتھ تھامے کمرے سے نکل کر پچھواڑے حصے میں گیا۔

چھوٹی سی جگہ پر انیس کی چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں، جن پر چند بچے بیٹھے تختی پر لکھے حرفوں کو پڑھ رہے تھے، قریب ہی ایک چھوٹی سی میز اور کرسی رکھی تھی جہاں دینو بابا کا نو عمر بیٹا، استاد کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

ابھی تو ابتدا ہے، بس گوٹھ والوں کی توجہ کی ضرورت ہے پھر ہستہ ہستہ بچے بھی نے لگیں گے، اسے تم شہر کے اسکولوں سے کمپیئر نہ کرنا، بس یوں سمجھو یہ ابتدائی زمانے کی طرح ہے، جہاں پہلے لوگ علم کے حصول کے لئے سفر کرتے تھے، فرش پر بیٹھ کر مٹی میں اٹ کر علم حاصل کرتے تھے محض اپنے جذبہ شوق کی وجہ سے۔

اور بد قسمتی یہ ہے کہ اتنی ترقی کرنے اور وافر سہولیات ہونے کے باوجود، یہ غریب گوٹھ والے اب بھی علم اتنی مشکلوں سے حاصل کر سکتے ہیں اور دیکھو کر بھی سکتے ہیں یا نہیں، میری اور دوسرے لڑکوں کی ادنیٰ سی کوششیں ہیں یہ۔

اسکول کے صحن میں کھڑا سجاوٹ منافعانہ لہجے میں کہہ رہا تھا تاہم وہ اس نقطے کے غار سے ہی انتہائی خوش تھا، جیسے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو اور جیسے یہ اختتامی مرحلہ ہو۔

زیمل کی خوشی بھی دیدنی تھی وہ بھی یوں سرور دکھائی دے رہی تھی، جیسے یہ کارنامہ خود اس نے انجام دیا ہو، اس نے بڑے فخر اور محبت سے سجاوٹ کو دیکھا۔



گے بہت مشکلیں نہیں گی سجاوِل، کیسے سر کرو گے۔ سجاوِل کندھے اچکا کر، اس کے ساتھ کھلی فضا میں گیا۔

مشکلیں تو ہوتی ہی سر کرنے کے لئے ہیں، بس تم دعا کرنا کہ خدا گوٹھ والوں کو بھی استقلال عطا کرے اور مجھے بھی، باقی کام، زور بازو جب تک سلامت رہے پورا ہو ہی جائے گا، بس استقامت ہو اور خدا پر بھروسہ کچھ مشکل نہیں اور وہ مرد ہی کیا جو مشکلوں کو سر کر کے مسرور نہ ہو۔

یقین کرو زیمل میری خواہش ہے کہ ہمارے گوٹھ کا بچہ بچہ اتنا باشعور ضرور ہو جائے کہ اپنا برا بھلا پہچان سکے ان بڑے لوگوں کو ہی اپنا سب کچھ نہ مانیں ان کے گھٹنے سے بہتر مر جانا پسند کریں۔ اس کا چہرہ فرط جذبات سے تپنے لگا۔

کیا میں بھی جہاد میں شامل ہو سکتی ہوں۔

اس کی نرم وازا بھری اس نے اپنے ہاتھوں کے سنہری کنگن اتار کر سجاوِل کی طرف بڑھا دیئے۔

ایک اینٹ میرے نام کی بھی ہونی چاہیے۔ سجاوِل، مجھے بھی تو فخر کرنے کا موقع ملے۔

سجاوِل لمحہ بھر کو گنگ رہ گیا، اس کی نظریں اس کی سونی کلائیوں پر جم گئیں۔

نہیں، نہیں زیمل یہ پہن لو۔ اس نے بھاری لہجے میں کہا۔

کیوں یہ میں تمہارے اپنے خرچے کے لئے تو نہیں دے رہی، یہ تو میں ان معصوم اور ننھی

کونپلوں کو پیاری کے لئے دے رہی ہوں، میرا دل بھی چاہتا ہے کہ یہ کونپلیں اب نرم لچکتی شاخ نہ بنیں جس سے ٹکرانے والا خود پاش پاش ہو جائے، رکھ لو نا سجاوِل۔ اس کا لہجہ التجا یہ ہو گیا، پلکوں پر ستارے جگمگانے لگے۔

سجاوِل نے یہ کنگن لیتے ہوئے اس کے ہاتھ بھی تھام لیے۔

ان کلائیوں میں ایک دن اپنے ہاتھوں سے بہت سا زیور پہناؤں گا۔ اس کی واڑ بڑی بوجھل تھی۔

زیمل کا دل ایک انوکھی خوشی سے بھر گیا، ایسی خوشی جو کبھی محسوس نہ ہوئی ہو۔

مجھے چاندی اور سونے کے کھلتے زیورات کی کبھی تمنا نہیں رہی سجاوِل، یہ ہوں بھی تو کیا اور نہ ہوں بھی تو کیا۔ اس کی پلکیں انھیں پھر لرز کر جھک گئیں۔

میں، میں بھی، ہر عورت کی طرح سہاگن بننا چاہتی ہوں، کیا مجھے اپنے نام کا زیور پہناؤ گے سجاوِل، ایسا زیور جو کبھی نا ترے، میری روح کو شانت کر دے، میری زندگی کو سونا بنا دے۔ سجاوِل علی شاہ اسے بڑی پیاری نظروں سے دیکھنے لگا، وہ اپنے ہر رنگ میں اتنی ہی خوبصورت دل موہ لینے والی تھی یا صرف اسے لگا کرتی تھی۔

اس نے نرمی سے اس کے نازک ہاتھ پر اپنے ہاتھ کا دباؤ ڈال کر خاموشی کی زبان میں یقین دلایا۔

وڈیری زیمل۔ بلقیس کی واڑا بھری تو وہ دونوں عالم مدہوشی سے حال میں گئے، وہ

جلدی سے پیچھے ہٹی تھی، سجاول بھی قدرے جھینپ کر بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

حویلی سے گڈی گئی ہے ادا سچل انتظار کر رہا ہے۔

اوہ، اتنی دیر ہو گئی ہے۔ اس نے اپنے سرخ سرخ چہرے کو اٹھا کر بلیس کی طرف دیکھا  
بلیس شرارت سے مسکرانے لگی۔

بہت شریر ہو گئی ہو۔ اس نے ہلکی سی پیار بھری چپت اسے ماری تو وہ اپنے پیارے بھائی  
کے شانے سے لگ گئی، سجاول نے اسے دائیں بازو کے گھیرے میں لے لیا۔

اب اس کا بھی انتظام کرنا پڑے گا، کیوں زیمل۔ وہ بولا تو اب شرمانے اور جھینپنے کی باری  
بلیس کی تھی۔

زیمل حق نواز سجاول سے ملاقات کر کے اپنے اندر بے پایاں مسرت سمیت کر حویلی  
میں ئی تو چھوٹی ماں زینت نے اسے بتایا کہ بابا سائیں اسے یاد کر رہے تھے، وہ  
پیغام سنتے ہی بابا سائیں کے کمرے کی طرف چلی ئی مگر دروازے پر دستک دینے سے  
پہلے اندر سے ئی واز پر اس کا ہاتھ ٹھہر گیا، یہ بابا سائیں کی واز تھی۔

ہاں یہ لڑکا سجاول بھی بڑا اونچا اڑ رہا ہے ج کل، چلو دیکھتے ہیں کتنا اڑ سکتا ہے۔  
پ اس روز بھی اس کی بدتمیزی برداشت کر گئے تھے بابا سائیں جبکہ میرا تو  
رت (خون) ہی کھول اٹھا تھا، یہ مالکوں سے بات کرنے کا کونسا انداز ہے اس کا، دو چار کتابیں  
پڑھ کر ہمارے منہ بے گئے گا۔



یہ مہران شاہ کی واز تھی کڑوی، کھر دری اور غرور سے بھری ہوئی۔

کمدار، کیا رپورٹ لائے ہو، ذرا بابا سائیں کو بھی بتاؤ نا، پتا نہیں اب بابا سائیں اتنے بے خبر کیوں رہنے لگے ہیں۔

سائیں جو کہوں گا سچ کہوں گا، سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔

کمدار کی واز ابھری اور بابا سائیں کے حقے کی گڑ گڑاہٹ تیز ہو گئی۔

امداد علی کے اس چھوکرے نے اپنے گھر کے خالی حصے میں اسکول کھول لیا ہے سائیں، میں نے اپنی گناہگار نکھوں سے دیکھا ہے دو چار بچے بھی بیٹھے تھے اور زور زور سے پڑھ رہے تھے وہ امہوں (موں) کی فصل پر کام کرنے والی دینو اس کا چھوکرہ ماسٹر بنا ہوا ہے۔ کمدار یہ کہہ کر چپ ہوا تو ایک دولہے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

ادھر زمیل کا دل سینے کی چار دیواری میں کانپا اس کے کان بابا سائیں کا جواب سننے کے منتظر تھے اور دل ایک انجانے خوف سے دھڑکنے لگا تھا۔

ہوں، تو یہ چھوکرہ عملی میدان میں بھی اتر چکا ہے۔

دیکھ لیجئے، یہی امداد علی جو ہمارے سامنے ٹھیک سے کھڑا نہیں ہو پاتا اس کا بیٹا ہمارے برابر کھڑا ہونے لگا ہے۔

معافی سائیں، میں نے سجاد کو گوٹھ کے دوسرے چھوکروں کو جمع کر کے بڑی بڑی تقریریں کرتے بھی دیکھا ہے۔



بابا مہران دیواریں ڈھانے سے پھر دیواریں بن جائیں گی ان دیواروں کے اندر نے والوں کو ہی ڈرا کر روک دیا جائے تو۔۔۔۔۔ خالی دیواریں بلے کی طرح ہی ہو جائیں گے۔ کیوں کمندار، ڈرائے والے دی تو ہیں ناتمہارے پاس، مگر ہاں اتنی جلدی شروع نہ ہو جانا ابھی انتظار کرو۔

یہ مہران شاہ تو جذباتی ہو جاتا ہے بابا اس طرح تو تم، کسی کام نہ رہو گے تحمل پیدا کرو اپنے اندر، یہ سچے اور کھر درے لوگوں کی طرح جذباتی ہو جانے والی عادت خاص فائدہ مند نہیں ہوتی بلکہ ہاتھ سے بہت کچھ نکل جاتا ہے، ہمیشہ ٹھنڈا کر کے کھاؤ گرم کھانے سے منہ جل جاتا ہے پٹ، یاد رکھنا جو کام نکھ کے اشارے سے ہو جائے وہاں زبان نہیں کھولتے، اور جو کام زبان سے ہو رہا ہو، وہاں لاشی نہیں اٹھاتے۔

بابا سائیں کی ہنسی ابھری جو تیر بن کر زیل حق نواز کی رگ رگ کو چھید گئی۔ اس سے اب مزید کھڑا نہ رہا گیا، وہ پلٹی تو سامنے تے سلطان شاہ کو دیکھ کر اسے سنبھلنا پڑا۔

کیا ہوا، خیر تو ہے ادی۔ اس کا سفید پڑتا چہرہ دیکھ کر وہ ٹھہ کر رک گیا۔ ہاں سب خیر ہے۔ وہ زبردستی مسکرائے کی کوشش کرنے لگی۔ پر تمہارے چہرے سے تو نہیں لگتا۔ سلچان شاہ مسکرایا اور نرمی و محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔



کیا بات ہے اوی، کوئی بات ہوگئی ہے، بابا سائیں نے کچھ کہہ دیا ہے۔  
ارے نہیں وہ بس تھکن ہوگئی ہے چاچا کے یہاں سے کی ہوں نائب ذرا  
رام کروں گی۔ وہ مزید رکی نہیں اور سلطان شاہ کا ہاتھ نرمی سے تھپک کر سیڑھیاں چڑھ  
گئی۔

بابا سائیں کی باتوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا اسے لگا اس کی ساری خوشی ساری مسرت  
بھک سے اڑ گئی ہو، اب ایک خوف دل میں سمٹ یا تھا۔  
(کہیں وہ لوگ سجاد کو کوئی نقصان نہ پہنچا دیں اوف۔۔۔۔۔ کتنے فخر سے وہ اسے  
اسکول دکھا رہا تھا،)

اس کی نکلیں جلنے لگیں چہرے پر اتنا سارا پانی بہانے کے باوجود ایک گ تھی جو رگ  
رگ سے نکلتی محسوس ہو رہی تھی، کسی پل قرار نہیں رہا تھا۔  
دوسری صبح وہ پچل کو بحیرہ چمکاتے دیکھ کر چپکے سے اس کے پاس چلی گئی، پچل اسے دیکھ  
کڑٹھ گیا، تشویش اس کے چہرے سے جھلک رہی تھی۔  
پچل، کیا سجاد شہر چلا گیا۔ اس کے لہجے کی بے چینی پر پچل نے ذرا سا سر اٹھا کر دیکھا  
پھر جلد ہی احترا مانا جھکا بھی دیا۔

منہ اندھیرے ہی نکل گیا تھا بس کا وقت وہی ہوتا ہے نا۔ اس نے کہا تو اس کے چہرے پر  
اطمینان کا رنگ پھیل گیا، ایک گہری سانس اس کے سینے کی تہہ سے خارج ہوگئی۔



انگلیاں مروڑنے لگا۔

ساڑن، پ کی تو وہ مانتا ہے پ ہی اسے سمجھاؤ۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا تو ایک لکڑے کو  
زیل کے چہرے پر سرنی اترئی، اس نے جلدی سے چادر پیشانی تک کھینچ لی، پھر سنبھل کر  
بولی۔

نہیں چل میں اس کو نہیں روکوں گی، اچھائی کا راستہ نہیں روکتے ورنہ ایک دن ہم سب  
برائیوں سے بھر جائیں گے۔ وہ پلٹ کر وہاں سے چلی گئی۔

سجاول علی شاہ کی یہی خوبیاں، یہی دلیرانہ جرات تو اس کا فخر اور مان تھیں وہ اسے اچھا  
لگتا تھا اس لئے کہ وہ سب کے لئے اچھا تھا وہ صرف اپنے لئے جینا نہیں چاہتا تھا بلکہ  
اس کے دل میں غریب اور کمزور کے لئے ہمدردی تھی، خلوص تھا، وہ خواب دیکھتا تھا  
صرف اپنے لئے نہیں گوشہ والوں کے لئے، ان کی بہتری اور خوشحالی کے لئے وہ کیسے اسے نیکی  
کی راہ سے روک دیتی، خوبصورت خواب دیکھنے پر پابندی لگا دیتی۔

مگر چل اس کی سوچ سے الگ پریشان سا بحیرہ کے قریب فرش پر اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔  
بھڑی زیل۔ وہ بیٹھک کے پاس سے گزری تو بابا سائیں کی پکار پر رک گئی اور پردہ اٹھا  
بکرا اندر گئی۔

جی بابا سائیں

وہ ان سے فاصلے پر کھڑی ہو گئی اور ایک نظر کمرے میں ڈالی، وڈیرہ حق نواز کے علاوہ



بڑی ماں بھی کمرے میں موجود اون سلائیوں میں ابھی ہوئی تھیں۔ انہیں تو بس اس نے ہمیشہ ان دھاگوں میں ہی الجھا دیکھا تھا۔

سلطان شاہ بھی موجود تھا بڑے صوفے پر بابا سائیں ٹانگ پر ٹانگ جمائے سگار سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان کے ہاتھ کے اشارے پر وہ ان کے سامنے کرسی پر ٹنگ گئی۔ کیا کرتی رہتی ہو سارا سارا دن۔

وہ اسے بغور دیکھ رہے تھے جانے کیا تھا ان کی نظروں میں اسے الجھن ہونے لگی۔ بس بابا سائیں کرنا کیا ہے، کبھی یہاں کبھی وہاں پڑی رہتی ہوں۔

بابا ہم نے تمہیں باہر نکلنے کی اجازت ضرور دے رکھی ہے مگر اتنی بھی نہیں، کہ تم جب دل چاہا من اٹھائے نکل جاؤ اور کمی ہاریوں کی بیٹی سے دوستیاں گانٹھتی پھر، اپنی اور ان کی حیثیت میں تمہیں فرق نظر نہیں تا بابا یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے نا۔ ان کی بات سن کر وہ کرسی سے کھڑی ہو گئی۔

بیٹھو ابھی تم سے کچھ اور بھی کہنا ہے۔

بابا سائیں کی بھاری تحکم بھری واژ نے اس کا اٹھا قدم پھر سے روک دیا اس نے بے قراری سے پہلو بدل کر بابا سائیں کو دیکھا اور بولی۔

یہ ساری باتیں خوشیوں کے حصول میں رکاوٹ بنتی ہیں، بابا سائیں بقیس اچھی لڑکی ہے میرے لئے یہی کافی ہے۔







# درامید کے درپونہ گر

اثر

سید مرزا